ADVANCE SOCIAL SCIENCE ARCHIVE JOURNAL
Available Online: https://assajournal.com
Vol. 04 No. 02. Oct-Dec 2025.Page#.4563-4582
Print ISSN: 3006-2497 Online ISSN: 3006-2500
Platform & Workflow by: Open Journal Systems

Research Methodology and the Research Writing of Dr. Ghulam Mustafa Khan: An Analytical Study

تحقیقی اسلوب اور ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی تحقیق نگاری: ایک تجزیاتی مطالعہ

Nasim Amir Alam
Assistant Professor, Worker's Intermediate Girls College, Kotri Sindh, Pakistan
nasim3138@gmail.com

Abstract
This analytical study examines the research methodology and prose style of Dr. Ghulam Mustafa Khan, a distinguished figure in Urdu literary and religious scholarship. The paper investigates the linguistic and terminological dimensions of research, the role and significance of research in literature, and the principles of literary investigation before delving into a comprehensive stylistic analysis of Dr. Ghulam Mustafa Khan's selected works. The study explores both the internal and external factors that shaped his research temperament, including his religious upbringing, the academic environment of Aligarh, and the profound influence of renowned researchers such as Maulvi Abdul Haq and Hafiz Mahmood Sheerani. Through detailed textual analysis of his major works including "Hali Ka Zehni Irtiqa," "Hazrat Mujaddid Alf Sani: Aik Tehqeeqi Jaiza," "Hamara Ilm-o-Adab," and "Matalib-ul-Quran," the paper demonstrates that Dr. Khan's research prose is characterized by simplicity, lucidity, eloquence, and a unique blend of research, criticism, and creative expression. The findings establish his pivotal role in strengthening the research tradition of Urdu literature, particularly in Karachi, and highlight how his accessible yet scholarly style made complex religious and literary subjects comprehensible to diverse readership while maintaining rigorous academic standards.

Keywords: Research Methodology, Urdu Literary Research, Dr. Ghulam Mustafa Khan, Prose Stylistics, Indo-Islamic Scholarship

تعارف

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی تحقیق نگاری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے سے قبل یہ امر ناگزیر اور نہایت ضروری ہے کہ تحقیق کے لغوی و اصطلاحی مفہوم، اس کی مختلف جہتوں اور متعدد اطلاقی صورتوں، نیز دیگر نامور اور مستند محققین کے تحقیقی نقطہ ہائے نظر اور ان کے وضع کردہ اصولوں کا ایک جامع اور تفصیلی ادراک حاصل کیا جائے تاکہ اس بنیادی فہم کی روشنی میں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کے تحقیقی کام کا ایک منصفانہ اور متوازن تجزیہ ممکن ہو سکے۔ اس کے علاوہ، تحقیق کی علمی و ادبی اہمیت و افادیت، ادب میں تحقیق کے کردار اور اس کی بنیادی حیثیت، اور ادبی تحقیق جیسے کلیدی اور بنیادی موضوعات کا بھی اسی تفصیل اور گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جانا اس لیے ضروری ہے کہ ان تمہیدی اور بنیادی مباحث کے بغیر ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی اسلوب کا کوئی بھی تجزیہ یا جائزہ ادھورا اور نامکمل رہے گا اور ان کے علمی کام کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین ممکن نہیں ہو سکے گا۔

یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کا تحقیقی کام اپنی نوعیت اور وسعت کے اعتبار سے بے حد تفصیل طلب، عمیق مطالعے کا متقاضی، اور گہری علمی توجہ کا طالب ہے جس کے لیے ایک منظم اور مربوط تحقیقی طریقہ کار کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں مقالہ نگار نے ابتدا ہی میں اس امر کی صراحت کر دی ہے کہ مقالے کے لیے ڈاکٹر صاحب کی صرف چند منتخب کردہ کتب اور ان میں موجود تحقیقی مواد کو ہی موضوعِ بحث و تحقیق بنایا گیا ہے اور انہی

کتب کی روشنی میں ان کی تحقیقی نثر کا تجزیہ پیش کیا جارہا ہے تاکہ ایک متعین اور محدود دائرے میں رہتے ہوئے زیادہ سے زیادہ گہرائی اور تفصیل کے ساتھ ان کے اسلوب کا جائزہ لیا جاسکے۔ چنانچہ اس تمہیدی باب میں ہم پہلے تحقیق کی بنیادی اور جامع تعریف سے اپنی بحث کا آغاز کریں گے اور پھر بتدریج آگے بڑھتے ہوئے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے تحقیقی اسلوب کے تجزیے تک پہنچیں گے۔

تحقیق: لغوی و اصطلاحی مفہوم اور بنیادی تعریفات

تحقیق کے لغوی اور اصطلاحی معنوں میں ایک بنیادی اور واضح فرق پایا جاتا ہے جس کا ادراک کسی بھی تحقیقی کام کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ لفظ "تحقیق" عربی زبان کا ایک قدیم اور بلیغ لفظ ہے جس کا مادہ "حق" ہے اور یہ باب "تفعیل" سے وضع شدہ ہے۔ عربی لغت کے ماہرین اور علمائے لغت کے نزدیک لفظ تحقیق کا بنیادی اور مرکزی مطلب "حق یا سچائی کو ثابت کرنا" ہے یعنی ایسے دلائل اور شواہد پیش کرنا جن کی بنیاد پر کسی امر کی حقیقت کو منکشف کیا جاسکے اور اس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جاسکے۔ لغات کی کتابوں میں اس لفظ کے مختلف معانی اور مترادفات بیان کیے گئے ہیں جن میں تلاش، تفتیش، کھوج، دریافت، پرکھ چول، چھان بین، اور تحقیق و جستجو جیسے الفاظ شامل ہیں اور یہ تمام معانی کسی نہ کسی طور پر اصل حقیقت تک پہنچنے کی انسانی کوشش کی طرف اشارہ کرتے ہیں (درانی، ۲۰۱۱، ص ۱۴)۔ اسی طرح جب ہم تحقیق کے اصطلاحی مفہوم کی طرف آتے ہیں تو ہمیں مختلف محققین اور اہل علم کی متعدد اور متنوع آراء ملتی ہیں جن میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے زاویے اور اپنی اپنی علمی بصیرت کے مطابق اس کی تعریف پیش کی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ جو خود ایک ممتاز محقق اور بلند پایہ نقاد تھے، تحقیق کی اصطلاحی تعریف کو انتہائی جامع اور واضح الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ "تحقیق کے لغوی معنی کسی شے کی حقیقت کا اثبات ہے جبکہ اصطلاحاً یہ ایک ایسے مخصوص طرزِ مطالعہ اور منظم طریقہ کار کا نام ہے جس میں کسی بھی موضوع پر موجود دستیاب مواد کے صحیح یا غلط ہونے کو بعض مسلمات اور طے شدہ اصولوں کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے اور اس پرکھنے کے بعد ہی کسی حتمی نتیجے تک پہنچا جاتا ہے" (بہ حوالہ صفدر علی، س ن، ص ۱۳)۔ اس تعریف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تحقیق محض معلومات کی ترتیب یا بیان کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک منظم فکری عمل ہے جس میں مواد کو پرکھنے، جانچنے اور اس کی صحت کو یقینی بنانے کے لیے ایک خاص طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے۔

اسی سلسلے میں قاضی عبدالودود نے تحقیق کی ایک انتہائی مختصر مگر بلیغ اور جامع تعریف پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "تحقیق درحقیقت کسی بھی امر یا شے کو اس کی اصل اور حقیقی شکل میں دیکھنے کی ایک مخلصانہ اور دیانت دارانہ کوشش ہے" (ایضاً)۔ اس تعریف میں خلوص اور دیانت کو تحقیق کا بنیادی وصف قرار دیا گیا ہے جس کے بغیر تحقیق کا پورا ڈھانچہ ہی بے معنی اور بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک محقق کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ کسی بھی موضوع یا مسئلے کو بغیر کسی تعصب، جانبداری، یا پیشگی رائے کے دیکھے اور اسے اس کی اصلی حالت میں سمجھنے کی کوشش کرے۔

پروفیسر صفدر علی نے اس تعریف کی مزید وضاحت اور تشریح کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ "تحقیق کا مفہوم دراصل دوبارہ تلاش کرنے کا ہے یعنی جہاں دوسرے اہل علم اور محققین نے پہلے سے تلاش کر رکھا ہے اور مواد جمع کر رکھا ہے وہیں سے دوبارہ اپنی تلاش کا آغاز کرنا اور اس مسلسل کوشش کے نتیجے میں کوئی ایسی نئی بات یا ایسا نیا پہلو دریافت کر لینا جسے دوسرے تلاش کرنے کے باوجود بھی نہیں ڈھونڈ پائے تھے یا جس تک ان کی رسائی ممکن نہیں ہو سکی تھی" (ایضاً)۔ اس وضاحت سے تحقیق کی تخلیقی اور اختراعی جہت بھی سامنے آتی ہے جس کے مطابق ایک محقق کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ وہ پہلے سے موجود معلومات کو دہرا دے بلکہ اس کا اصل فریضہ تو یہ ہے کہ وہ علم کے دائرے میں کسی نئے اضافے کا باعث بنے۔

ان تعریفات کے مجموعی مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تحقیق ایک ایسا مسلسل اور مربوط عمل ہے جس کے ذریعے سچ کو ثابت کیا جاتا ہے اور سچائی کی تلاش کے لیے مستند معلومات اور حوالہ جات کو اکٹھا کر کے انہیں احاطہ تحریر میں لایا جاتا ہے۔ یعنی کسی بھی شے کو اس کی اصل اور حقیقی حالت میں دیکھنا، سمجھنا، اور دوسروں کے سامنے پیش کرنا ہی تحقیق کی بنیادی روح ہے۔

تحقیق کی اہمیت وافادیت: علمی وادبی تناظر

تحقیق کی اہمیت اور افادیت کسی بھی علمی، ادبی، اور تحقیقی مباحثے کا ایک بنیادی اور ناگزیر جزو ہے جس کے بغیر کسی بھی تحقیقی کام کی قدر و قیمت کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ پروفیسر صفدر علی نے بڑی فصاحت اور وضاحت کے ساتھ اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ "تحقیق ہی وہ بنیادی ذریعہ ہے جس کے توسط سے ادبی عقائد و نظریات کے اصل ماخذ اور بنیادی سرچشموں تک رسائی ممکن ہو پاتی ہے اور ان کی حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے بغیر ادبی نظریات محض سطحی اور غیر مستند معلومات کی بنیاد پر قائم ہو جاتے ہیں جو کسی بھی وقت گر سکتے ہیں" (صفدر علی، س ن، ص ۲۱)۔ یہ بحث اس حقیقت کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ تحقیق ادب کی ترقی، ترویج، اور اشاعت کے لیے ایک بنیادی اور سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے جس کے بغیر ادب کا پورا ڈھانچہ ہی متزلزل اور غیر مستحکم رہے گا۔

تحقیق کے ذریعے سب سے پہلے تو ادبی شخصیات کا ایک بہترین، جامع، اور مستند تعارف ممکن ہو پاتا ہے جس میں ان کی زندگی، ان کے حالات، ان کے افکار و نظریات، اور ان کی ادبی کاوشوں کا ایک مکمل اور مربوط خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ، تحقیق ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کے توسط سے کسی بھی ادیب یا شاعر کے اسلوب کی خامیوں اور خوبیوں کی واضح اور مدلل وضاحت ممکن ہوتی ہے اور اس کے فنی محاسن و معائب کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مزید برآں، تحقیق کا عمل مختلف ذرائع اور مختلف مقامات سے بکھری ہوئی معلومات کو یکجا کرنے، انہیں منظم اور مربوط صورت میں پیش کرنے، اور ان سے علمی و ادبی نتائج اخذ کرنے کا بھی فریضہ انجام دیتا ہے۔ انہی تمام وجوہات اور پہلوؤں کی بنا پر تحقیق کی اہمیت اور ضرورت کسی بھی علمی اور ادبی تناظر میں مسلمہ اور ناقابل تردید ہے۔

تحقیق کا عمل صرف ادبی نظریات کے ماخذ تک رسائی کا ذریعہ ہی نہیں بنتا بلکہ یہ نئی نئی باتوں اور نئے نئے حقائق کو منظر عام پر لانے کا بھی ایک مؤثر اور طاقتور وسیلہ ہے۔ یہ تحقیق کی ہی بدولت ہے کہ آج کا باشعور اور پڑھا لکھا انسان حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہے، وہم پرستی اور اندھی تقلید سے بیزار اور متنفر ہے، اور ہر قسم کے تعصبات اور تنگ نظریوں سے خود کو دور رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تحقیق کا فن ہر قسم کی منفی اور غیر معقول اصطلاحوں، تصورات، اور نظریات کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اور ان کی جگہ علم، دلیل، اور منطق کی بنیاد پر قائم حقائق کو فروغ دیتا ہے۔

تحقیق کے ذریعے نہ صرف ترقی کا عمل مسلسل جاری و ساری رہتا ہے اور نئی نئی باتیں اور نئے نئے حقائق سامنے آتے رہتے ہیں بلکہ اسلاف کے عظیم کارناموں اور ان کی لازوال علمی و ادبی کاوشوں کو بھی اسی فن کے ذریعے بہ احسن و خوبی یاد رکھا جاتا ہے اور انہیں فراموشی اور نظر اندازی کے اندھیروں سے بچایا جاتا ہے۔ یعنی اسلاف کے تحقیقی و تخلیقی کاموں کا علمی تجزیہ کرنا، ان کی صحیح اور مستند معلومات کو مرتب کرنا، ان کی تصانیف کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لینا، اور ان کی تمام تر ادبی و علمی کاوشوں کو تحقیق کے ذریعے ہی محفوظ اور زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ یہ وہ عظیم اور لازوال عمل ہے جس کے ذریعے نہ صرف اچھے اور برے کی پہچان اور تمیز ممکن ہوتی ہے بلکہ وہم پرستی، عقیدہ پرستی، اور شخصیت پرستی کے ان بتوں کا بھی قلع قمع ہوتا ہے جو صدیوں سے انسانی ذہنوں پر مسلط رہے ہیں اور جنہوں نے علمی اور فکری ترقی کی راہ میں بے شمار رکاوٹیں کھڑی کی ہیں۔

ادب میں تحقیق کا کردار اور اس کی بنیادی اہمیت

ادب میں تحقیق کے کردار اور اس کی بنیادی اہمیت کا سوال اتنا اہم، بنیادی، اور مرکزی ہے کہ جب تک اس کی واضح اور مدلل وضاحت نہیں ہو جاتی، کسی بھی محقق کے تحقیقی کام کی حقیقی افادیت اور اس کی اصل قدر و قیمت کا درست اور منصفانہ تعین ممکن نہیں ہو سکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ تحقیق زندگی

کے ہر موڑ پر، ہر مرحلے پر، اور ہر شعبے میں انسان کی راہنمائی کرتی ہے اور اسے صحیح اور غلط، حق اور باطل، سچ اور جھوٹ کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ ادب کے میدان میں تو تحقیق کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ ادب انسانی جذبات، احساسات، خیالات، اور تجربات کا ایک ایسا پیچیدہ اور کثیر الجہات اظہار ہے جس کی تہوں تک پہنچنے کے لیے تحقیق کی روشنی ناگزیر ہے۔

پروفیسر صفدر علی نے ادب میں تحقیق کے کردار کو واضح کرتے ہوئے انتہائی جامع اور مدلل انداز میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "ادبی میدان میں تحقیق وہ بنیادی قوت ہے جو ادبی عقائد و نظریات پر کاربند رہنے یا ان کو ترک کر دینے کے بارے میں مختلف خیالات اور آراء کی معاونت کرتی ہے اور انہیں ایک مستند اور معقول بنیاد فراہم کرتی ہے۔ یہ تحقیق ہی ہے جو کسی بھی ادیب، شاعر، یا نقاد کے ادبی کارناموں پر ایک حتمی اور مدلل فیصلہ صادر کرتی ہے اور ان کی ادبی عظمت یا کم مائیگی کا تعین کرتی ہے۔ تحقیق ہی کے ذریعے ان کے ادبی میدان میں 'قد' اور 'حیثیت' کا صحیح اور منصفانہ تعین کیا جا سکتا ہے اور ان کے مقام و مرتبے کو متعین کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ، تحقیق ہی 'زبان' کے زمانے کا بھی درست تعین کرتی ہے اور قاری کو ان تمام لسانی خصائص اور خصوصیات سے آگاہ کرتی ہے جو اس زبان کے کسی خاص دور کی پہچان ہوتے ہیں" (صفدر علی، س ن، ص ۲۰)۔ اس تفصیلی بیان سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ادب کے میدان میں تحقیق کا کردار کتنا وسیع، گہرا، اور ہمہ گیر ہے اور یہ ادب کے تقریباً ہر پہلو اور ہر جہت کو اپنی گرفت میں لیتی ہے۔

گیان چند جین کا نقطہ نظر اور ادبی تحقیق کے مقاصد

گیان چند جین نے اردو ادبی تحقیق کے حقیقی مقاصد اور اس کی بنیادی روح کو واضح کرتے ہوئے اپنی معروف اور مستند تصنیف میں لکھا ہے کہ "جہاں تک اُردو کی ادبی تحقیق کا تعلق ہے، اس کا بھی بنیادی اور مرکزی مقصد یہی ہے کہ جن مصنفین، جن ادوار، جن علاقوں، جن کتابوں، اور جن متفرق تخلیقات کے بارے میں ہمیں بہت کم معلومات ہیں یا جو معلومات ہمیں ملی ہیں وہ ناقص، ادھوری، یا غیر مستند ہیں، ان کے بارے میں مزید معلومات حاصل کی جائیں اور اس علمی خلا کو پُر کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ اس کے علاوہ، ان موضوعات اور شخصیات کے بارے میں اب تک جو کچھ بھی ہمیں معلوم ہے اور جو معلومات ہمارے علم میں ہیں، ان کی بھرپور اور بے لاگ جانچ پڑتال کر کے ان میں پائی جانے والی غلط بیانیوں، غلط فہمیوں، اور غلط معلومات کی تصحیح کر دی جائے تاکہ اس غلط اور غیر مستند مواد کی بنیاد پر کوئی غلط اور غیر منصفانہ فیصلے صادر نہ کر دیے جائیں جو ادب کی تاریخ کو مسخ کرنے کا باعث بن سکتے ہیں" (جین، ۲۰۱۲، ص ۱۷)۔

دیکھا جائے تو پروفیسر صفدر علی اور گیان چند جین کے مذکورہ بالا بیانات سے تحقیق اور خصوصاً ادب میں تحقیق کے کردار کی اہمیت کو نہایت واضح اور مدلل طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس علم کے ذریعے نہ صرف غلط عقائد اور بے بنیاد نظریات کے بارے میں مضبوط اور معقول دلائل کے ساتھ آگاہی حاصل ہوتی ہے بلکہ ادب میں صدیوں سے رائج بدگمانیوں، غلط فہمیوں، اور غلط معلومات کی بھی بروقت تصحیح ممکن ہو پاتی ہے۔ ادب میں تحقیق کا کردار اس قدر اہم اور بنیادی ہے کہ اس کے بغیر ادب کی صحیح معنوں میں ترقی اور ارتقا کا تصور کرنا بھی مشکل اور ناممکن سا لگتا ہے۔ ادیب اور ادب مواد کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کا آپس میں گہرا اور ناقابل تسخیر رشتہ ہے۔ مواد کے صحیح یا غلط ہونے سے ادب کی مجموعی ادبی حیثیت اور اس کے معیار کو براہِ راست نفع یا نقصان پہنچتا ہے، لہٰذا اس کی ضرورت و اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے اور ادب میں ادبی تحقیق ایک نمایاں اور ناقابل فراموش حیثیت رکھتی ہے۔

ادبی تحقیق: جامع تعریف، بنیادی اصول، اور اسلوبیاتی تقاضے

تحقیق کی عمومی اور جامع تعریفات کا بغور جائزہ لینے کے بعد اب یہ امر بھی نہایت ضروری ہے کہ ادبی تحقیق کی مخصوص تعریف، اس کے مفہوم، اور اس کے دائرہ کار کی واضح اور مدلل وضاحت کی جائے، کیونکہ زیرِ نظر مقالے کے مرکزی موضوع میں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی دینی و ادبی تحقیقی نثر کا

تفصیلی تجزیہ بھی شامل ہے اور یہ تجزیہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ادبی تحقیق کے اصولوں اور معیارات کو واضح طور پر سامنے نہ رکھا جائے۔ لہٰذا یہاں پر مختصراً مگر جامع انداز میں ادبی تحقیق پر روشنی ڈالی جارہی ہے کہ ادبی تحقیق کیا ہے، اس کی نثر کیسی ہوتی ہے، اور اس کے بنیادی اصول وضوابط کیا ہیں، تاکہ فاضل محقق ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کے مقالات کو اور ان کے نثری اسلوب کو اسی متعین معیار اور کسوٹی پر پرکھا جاسکے اور یہ معلوم ہوسکے کہ ان کی تحقیق ادبی تھی یا غیر ادبی، اور اگر ادبی تھی تو کیا اس تحقیق میں ادبی تحقیقی اسلوب کی تمام نمایاں اور بنیادی خصوصیات شامل ہیں اور کیا ان کی تحقیق ادبی تحقیق کی جامع تعریف پر پوری اترتی ہے یا نہیں۔

پروفیسر صفدر علی نے ادبی تحقیق کے بنیادی اصولوں اور اس کے تقاضوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی معروف تصنیف میں لکھا ہے کہ "ادبی تحقیق میں ہر واقعہ، ہر بیان، اور ہر مسئلہ اپنی جگہ مسلم اور ایک خاص اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اسے کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم یہ امر بھی ذہن میں رہے کہ کوئی بھی واقعہ، بیان، مسئلہ، یا ادبی نکتہ صرف اسی وقت ہی قابل قبول اور مستند تصور ہو گا جب ہم اس کو اصولِ تحقیق کی کسوٹی پر پوری طرح جانچ پرکھ کر صاف ستھرا اور شکوک وشبہات سے پاک بنالیں گے۔ لہٰذا یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ واقعہ اور وہ بیان اس وقت کی تمام تر دستیاب معلومات اور شواہد کے مطابق ہر طرح کے شکوک وشبہات سے صاف اور پاک ہو اور اس کے تمام تر ماخذ اور حوالہ جات بھی قابلِ اطمینان، مستند، اور معتبر ہوں" (صفدر علی، س ن، ص ۱۵۶)۔ مذکورہ بالا اقتباس سے اس بات کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے کہ ادبی تحقیق میں جب بھی کوئی مسئلہ یا موضوع پیش کیا جائے تو اسے تحقیق کی کسوٹی پر خوب اچھی طرح پرکھ کر ہر قسم کے شک وشبہے سے پاک کر دینا چاہیے۔ اور اس ضمن میں جو حوالہ جات اور ماخذ استعمال کیے جائیں وہ بھی اعلیٰ معیار کے، مستند، اور قابل اعتماد ہونے چاہئیں۔ اس کے علاوہ، جو نثر لکھی جائے اس کے معیار کو بھی پرکھا جانا چاہیے کیونکہ اسلوبِ نگارش کی ہر تحقیقی مقالے میں اپنی ایک الگ اور نمایاں اہمیت وحیثیت ہوتی ہے، لہٰذا نثری اوصاف کا بیان بھی ادبی تحقیق کی بنیادی خوبیوں میں سے ایک اہم خوبی ہے جسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ادبی تحقیق کا طریقہ کار اور اس کی نوعیت

گیان چند جین نے ادبی تحقیق کے طریقہ کار اور اس کی بنیادی نوعیت کی وضاحت کرتے ہوئے انتہائی جامع اور واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ "ادبی تحقیق اپنی نوعیت اور ساخت کے اعتبار سے سائنس کے خالص تحقیق (Pure Research) کی طرح غیر اطلاقی یا تصوری ہوتی ہے اور اس میں عملی اطلاق کی بجائے نظری اور تصوری پہلو زیادہ غالب اور نمایاں ہوتے ہیں۔ اس کا طریقہ کار زیادہ تر تاریخی نوعیت کا ہوتا ہے جبکہ تجربیاتی پہلو اس میں نسبتاً کم اور محدود ہوتا ہے۔ تاہم اکثر صورتوں میں یہ دونوں طریقے یعنی تاریخی اور تجربیاتی، ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، لیکن اس امتزاج میں تاریخی عنصر قدرے زیادہ اور غالب ہوتا ہے جبکہ تجربیاتی عنصر قدرے کم اور محدود ہوتا ہے" (جین، ۲۰۱۲، ص ۱۸)۔ اس بیان کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر کسی شاعر کے کلام کی تحقیق کرنی ہو کہ وہ واقعتاً اسی شاعر کا ہے یا کسی اور کا اور اسے غلط طور پر اس شاعر سے منسوب کر دیا گیا ہے، تو اس کے لیے ایک طرف تو اس زمانے کے مختلف نسخوں، مخطوطوں، اور تاریخی حوالوں کا جائزہ لیا جائے گا کہ وہ اشعار کس دور سے ملتے ہیں اور کن کن تذکروں اور تاریخوں میں وہ اس شاعر سے منسوب کیے گئے ہیں۔ دوسری طرف اس کے ساتھ ساتھ ایک لسانیاتی تجزیہ بھی کیا جائے گا جس کے ذریعے یہ جانچا جائے گا کہ وہ الفاظ، تراکیب، اور محاورات جو اس کلام میں استعمال ہوئے ہیں، کیا وہ واقعی اسی دور کے ہیں جس دور کا وہ شاعر ہے یا اس میں کسی بعد کے دور کی زبان کی جھلک ملتی ہے۔

پروفیسر صفدر علی نے اسی ضمن میں ایک اور اہم نکتے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے کہ "ادب کی تاریخ میں عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جب ایک شاعر اپنے کمالِ فن، اپنی شہرت، اور اپنی مقبولیت کی وجہ سے بہت زیادہ مشہور ومعروف ہو جاتا ہے، تو بعد کے ادوار میں بعض اسی دور کے یا اس سے بھی پہلے کے کم معروف اور گمنام شعراء کے 'اچھے اور منتخب اشعار' اس معروف شاعر سے منسوب کر دیے جاتے ہیں اور یوں وہ اشعار غلط طور پر اس کی

شاعری کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں اور یہ صرف ادبی تحقیق ہی ہے جو یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ شعر دراصل کس شاعر کا ہے اور اس کی اصل حقیقت کیا ہے" (صفدر علی، س ن، ص ۱۷۵)۔ یہ بیان ادبی تحقیق کی اہمیت اور ضرورت کو مزید واضح اور مدلل کرتا ہے۔

تحقیقی اسلوب کی اہمیت اور اسلوبیاتی جائزے کی ضرورت

اب ہم ایک اور انتہائی اہم اور بنیادی نکتے کی طرف آتے ہیں جس پر ڈاکٹر عطش درانی نے بڑی صراحت، گہرائی، اور علمی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور وہ ہے تحقیقی اسلوب یا اسلوبیاتی جائزہ و تجزیہ۔ ڈاکٹر عطش درانی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ "ادبی اور لسانی تحقیق میں تنقید اور اصولِ جرح کے استعمال کے سبب گویا رسمیاتی تحقیق (Formalities of Research) کو لازمی طور پر اسلوبی بھی ہونا پڑتا ہے۔ یعنی مجازی اور اصطلاحی زبان کے بعض تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اسے ایک قابلِ اسلوب انداز یا تحقیقی طریقے اور زبان میں بیان کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ صرف مواد کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ اسلوب کے اعتبار سے بھی معیاری اور قابل قبول ہو۔ ڈاکٹر گیان چند جین اس بات کی پرزور تائید کرتے ہیں کہ تحقیق کو ایک مناسب اور موزوں 'ادبی' اسلوب میں بیان کیا جانا چاہیے تاکہ اس میں خشکی اور غیر دلچسپ ہونے کا عیب پیدا نہ ہو۔ تاہم رسمیاتی تحقیق کو بیان کرنے کا بھی اپنا ایک علیحدہ اور مخصوص لسانی انداز یا قرطاس اسلوب (Style Sheet) ہوتا ہے جس کی پابندی ضروری ہے" (درانی، ۲۰۱۱، ص ۱۸)۔

یہاں پر ڈاکٹر عطش درانی نے جس نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ ایک مقالہ جو تحقیقی بھی ہوتا ہے یا ادبی بھی ہو سکتا ہے، یا پھر تحقیقی و ادبی دونوں پہلوؤں کا حامل ہو سکتا ہے، اس کے بیان کرنے کا انداز کیسا ہونا چاہیے، زبان کیسی استعمال کی گئی ہے، کیا وہ مقفّٰی ہے یا مسجّع، یا پھر رواں اور سلیس ہے یا بھاری بھر کم اور ثقیل علمی اصطلاحوں سے پُر ہے۔ ایک اچھے اور معیاری تحقیقی مقالے کے لیے مناسب اور موزوں اسلوب کی اہمیت کو تقریباً ہر بڑے محقق نے تسلیم کیا ہے اور اس پر زور دیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ جب تحقیق نگاری میں اسلوب پر بھی اتنی ہی توجہ دی جاتی ہے جتنی مواد پر، تو پھر اس تحقیق نگاری میں وہ خشکی، بے کیفی، اور بوریت نہیں رہتی جو عموماً عام قاری یا نو آموز مقالہ نگار کو اس خار زار میں قدم رکھنے سے باز رکھتی ہے اور اسے تحقیق جیسے اہم اور ضروری کام سے دور رکھتی ہے۔ ایک تحقیقی مقالہ جب کسی ادبی شان یا مناسب اور خوبصورت اسلوب کے ساتھ پیش کیا جائے گا تو اس کی اہمیت، افادیت، اور قبولیت میں یقیناً اضافہ ہو گا۔

ادبی تحقیق کے دائرہ کار کی وسعت اور اس کے مختلف پہلو

ڈاکٹر عطش درانی نے آگے چل کر مزید قیمتی اور علمی معلومات سے بہرہ ور کرتے ہوئے تحقیق کے ادبی پہلو کی مزید تفصیل اور وضاحت کی ہے اور اسے دو بنیادی جہتوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ تحقیق کا ادبی پہلو بنیادی طور پر دو طرح سے ہمارے سامنے آتا ہے: "پہلا پہلو یہ ہے کہ ہر تحقیق کے لیے متعلقہ ادبی ذخیرے کا مطالعہ نہایت ضروری اور ناگزیر ہوتا ہے، جیسا کہ دراصل متعلقہ دستاویزات، سابقہ تحقیقات، اور پہلے سے موجود مقالات کا گہرا اور وسیع مطالعہ کہا جاتا ہے جو بغیر کیے کسی بھی تحقیق کا آگے بڑھنا ممکن نہیں ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ تحقیق ادب کے مختلف اور متنوع موضوعات پر انجام دی جاتی ہے جو کہ ادبی تخلیقات، دستاویزات، شخصیات، اور سماجی رجحانات جیسے اہم پہلوؤں پر مشتمل ہو سکتی ہے اور ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ اور تفصیلی تحقیق کی جا سکتی ہے" (درانی، ۲۰۱۱، ص ۱۸-۱۹)۔ اب اس بیان کی روشنی میں یہ بات بھی واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ شخصیات یا سماجی رجحانات اور ادبی تخلیقات جیسے اہم اور بنیادی موضوعات بھی تحقیق (خصوصاً ادبی تحقیق) کا حصہ بن سکتے ہیں اور ان پر باقاعدہ اور منظم تحقیق کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان کی دینی و تحقیقی نثر کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب اور ضروری ہو گا کہ ڈاکٹر عطش درانی کی تحقیقی کتاب سے "تحقیقی اسلوب" کے خواص اور خصوصیات کی چند مثالیں دیکھتے چلیں، تاکہ ان کو سامنے رکھتے ہوئے یا انہیں معیار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ہم محقق ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان کے مقالات کی نثر کا بھرپور اور منصفانہ جائزہ یا تجزیہ کر سکیں۔

تحقیقی اسلوب کے نمایاں خواص اور خصوصیات

ڈاکٹر عطش درانی نے تحقیقی اسلوب کے اہم اور نمایاں خواص کو اجاگر کرتے ہوئے مختلف معتبر حوالوں کے ساتھ اپنی تحقیقی کتاب میں تحریر کیا ہے کہ تحقیقی اسلوب کی سب سے اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ صفات کے استعمال میں ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں موصوف کو کچھ بڑھا چڑھا کر پیش نہ کر دیا جائے اور حقیقت کو مبالغے اور اغراق کے پردے میں چھپا نہ دیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے خود قاضی عبدالودود صاحب کے رسالہ "تحریر" سے مثالیں پیش کی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح بعض الفاظ اور صفات محض برائے آرائش اور بلاضرورت استعمال کر لیے جاتے ہیں جو تحقیق کے بنیادی اصولوں کے منافی ہیں۔ مثلاً لکھنؤ سے چند میل کے فاصلے پر واقع علماء و فضلا کے ایک مرکز کاکوری کے بارے میں جب "بہت بڑا" کا لفظ استعمال کیا گیا تو قاضی صاحب نے اسے "محض برائے آرائش" قرار دیا اور اسے غیر ضروری اور زائد از ضرورت بتایا۔ اسی طرح رسالے کے اسی شمارے میں ساحر کاکوری کے مشہور اور قابل شاگردوں کے جو نام دیے گئے تھے ان میں سے کئی کے ناموں کے بارے میں قاضی صاحب نے دعویٰ کیا کہ انھیں حقیقت میں "مشہور" نہیں کہا جا سکتا اور یہ لفظ ان کے لیے موزوں اور مناسب نہیں ہے (درانی، ۲۰۱۱، ص ۲۷۳-۲۴۸)۔

ڈاکٹر عطش درانی نے ڈاکٹر گیان چند جین کے حوالے سے مزید لکھا ہے کہ "تحقیق میں اسلوب کے بارے میں ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ عالمانہ اور بھاری بھر کم ہونا چاہیے یا پھر اسے سلیس، عام فہم، اور شگفتہ بھی ہونا چاہیے۔ اس بارے میں ڈاکٹر گیان چند جین نے بھرپور بحث و تمحیص کے بعد یہ متوازن اور معقول فیصلہ کیا ہے کہ مقالے میں جہاں حقائق کی بات ہو رہی ہو اور اخذ نتائج کا اہم اور نازک مرحلہ ہو، وہاں تو رنگینی، عبارت آرائی، اور لفظی بازی گری کی کوئی گنجائش قطعاً نہیں ہے اور وہاں سادہ اور براہ راست انداز ہی مناسب اور مطلوب ہے۔ تاہم اگر اس کے باوجود اسلوبِ بیان پر کشش، دلآویز، اور شگفتہ ہو جائے تو اس میں کوئی مضائقہ اور قباحت نہیں ہے بلکہ یہ ایک اضافی خوبی تصور ہو گی۔ تحقیق کی تاریخ میں ایسی روشن اور تابندہ مثالیں بھی موجود ہیں جہاں مختلف محققین نے تحقیقی اسلوب کی تمام بنیادی پابندیوں اور تقاضوں کی پیروی کے ساتھ ساتھ شگفتگی، شادابی، اور اسلوبیاتی حسن کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور ان کا کام دونوں اعتبار سے اعلیٰ اور معیاری رہا" (درانی، ۲۰۱۱، ص ۲۷۳-۲۴۸)۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان بطور محقق: ایک جامع تعارف اور ان کا علمی مقام

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان بنیادی طور پر ایک محقق تھے اور ان کی پوری علمی اور ادبی زندگی کا مرکز و محور تحقیق ہی تھا۔ ان کے بارے میں یہ حقیقت بڑی اہم ہے کہ شروع ہی سے، یعنی اپنی علمی زندگی کے ابتدائی دور ہی سے، آپ کا اندازِ فکر اور اندازِ مطالعہ محققانہ تھا اور اس میں وہ تمام بنیادی صفات اور خصوصیات موجود تھیں جو ایک کامیاب اور بڑے محقق کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ بہت چھوٹی عمر سے ہی سنین اور تواریخ کے حوالہ جات کے ساتھ معلومات کو مرتب کر کے تحریر کرنے کا ملکہ، ایک وسیع اور گہرا مطالعہ جو کسی ایک موضوع یا میدان تک محدود نہیں تھا بلکہ مختلف علوم و فنون اور مختلف موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے تھا، قدیم اور نایاب مخطوطات سے ایک فطری اور گہری دل چسپی جو ان کے تحقیقی مزاج کی غماز تھی، بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط اور صحیح عقائد اور معلومات کی نشاندہی اور ان کی تصحیح کا جذبہ، دور دراز کے کتب خانوں کے اسفار اور طویل سفر کا شوق، انتہائی صبر و تحمل، فکری توازن، اور برداشت و بردباری جیسی اعلیٰ اور نادر صفات پر مشتمل شخصی خوبیاں آپ کو ایک بہت کامیاب اور لائق محقق ثابت کرتی ہیں اور یہ تمام صفات ان کی شخصیت اور ان کے کام میں جابجا دیکھی جا سکتی ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کے علمی مقام اور ان کی تحقیقی عظمت کے بارے میں بڑے مدلل اور موثر انداز میں لکھا ہے کہ "ڈاکٹر صاحب قبلہ کو علمی تحقیق سے ایک غیر معمولی اور بے پناہ شغف اور لگاؤ ہے جو ان کے ہر کام اور ان کی ہر تحریر میں صاف جھلکتا ہے۔ ان کی تصنیف 'سید حسن غزنوی، حیات اور شاعری' سے لے کر ان کے انگریزی میں قلم بند کیے گئے تحقیقی مضامین کے مجموعے Studies in Literature تک (اور یہ ڈاکٹر صاحب قبلہ کے ان تمام تحقیقی مضامین کا ایک شاندار اور قابل قدر مجموعہ ہے جو انہوں نے انگریزی زبان میں تحریر فرمائے ہیں)، ان کی

تمام تر تحریریں دیدہ وری، ذہنی برق، تحقیق کے فطری اور پیدائشی رجحان، جہاں کاہی، اور اصابت رائے کا ایک پورا اور مکمل مرصع ہے جو ہمارے سامنے آتا ہے اور اپنی تمام تر آب و تاب کے ساتھ چمکتا دمکتا نظر آتا ہے"(فرخی، ص ۱۰)۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی تحریروں میں تحقیق، تنقید، اور تخلیق کی یکجائی

ڈاکٹر انوار احمد زئی نے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی انفرادیت اور ان کے کام کی امتیازی شان کو بیان کرتے ہوئے بڑی فصاحت اور جامعیت کے ساتھ رقم طراز کیا ہے کہ "اصناف کے اعتبار سے نثری تحریروں کا نہایت احتیاط اور باریک بینی کے ساتھ اگر ایک زاویہ بنایا جائے اور اس کا تجزیہ کیا جائے تو اس زاویے کے تین بنیادی اور اہم ترین زاویوں کو تحقیق، تنقید، اور تخلیق ہی کا نام دیا جا سکتا ہے اور یہی وہ تین بنیادی ستون ہیں جن پر اردو نثر کی عمارت قائم ہے۔ تخصص اور مہارت کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان تینوں میدانوں کی بھی الگ الگ جہتیں اور الگ الگ تقاضے رہے ہیں اور ان کو برتنے اور ان میں کام کرنے والی الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف شخصیتیں رہی ہیں۔ جن افراد نے تحقیق کے شعبے کو اپنایا اور اسے اپنی زندگی کا مقصد بنایا، وہ اسی دشت کی سیاہی اور اس کی مشکلات میں اپنی عمر عزیز کو گزار گئے اور اس میدان سے باہر نہ نکل سکے۔ جن حضرات نے تنقید کا میدان مارا اور اس میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا، وہ اس اکھاڑے کی حدود سے باہر نہ نکل سکے اور ان کا سارا کام تنقید کے دائرے میں ہی محدود رہا۔ اور جو لوگ تخلیق کے چمن زاروں اور گلستانوں کی طرف چل پڑے اور اس کی رنگینیوں میں کھو گئے، انھوں نے پلٹ کر کبھی یہ نہ دیکھا کہ تحقیق کرنے والے کیا کر رہے ہیں یا تنقید لکھنے والے کیا لکھ رہے ہیں اور کن مسائل سے دوچار ہیں۔ یہ تینوں اصناف ایک دوسرے سے بظاہر مربوط اور جڑی ہوئی نظر آنے کے باوجود حقیقت میں ایک دوسرے سے کس قدر الگ اور کس قدر مختلف ہیں، اس کا اندازہ اس سادہ سی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بڑے بڑے کتب خانوں تک میں ان تینوں اصناف اور میدانوں کے لیے الگ الگ شعبے، الگ الگ الماریاں، اور الگ الگ گوشے مختص ہیں۔ مگر جب کبھی ان تینوں دریاؤں کا سیل دیکھنا ہو اور ان تینوں کی یکجائی اور ہم آہنگی کا نظارہ کرنا ہو تو حضرت ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب کی تحریروں کو دیکھیے اور ان کا مطالعہ کیجیے"(انوار احمد زئی، ص ۱-۱۱)۔

اس طویل مگر انتہائی جامع اور بصیرت افروز اقتباس کو نقل کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی جن علمی و ادبی اور دینی تحقیقی تصانیف کی نثر کا تجزیہ پیش کیا جائے گا، ان کو پڑھنے اور ان کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد مذکورہ بالا اقتباس کی پوری طرح تصدیق ہوتی ہے اور اس کی صداقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ یعنی آپ کی تصانیف بیک وقت تحقیقی، تنقیدی، اور تخلیقی بھی ہوتی ہیں اور ان میں یہ تینوں عناصر اور جہتیں ایک دوسرے کے ساتھ اس خوبصورتی اور ہم آہنگی کے ساتھ پیوست ہیں کہ انہیں الگ الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے۔ بیشتر مضامین کی بھی یہی صورت ہے اور ان میں بھی یہی تینوں عناصر کارفرما نظر آتے ہیں۔ لہٰذا مذکورہ بالا اقتباسات سے ہی رہنمائی حاصل کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے دینی اور ادبی تحقیقات کی نثر کا جائزہ لیتے ہیں، کیونکہ آپ کی تصانیف کی نثر جہاں تحقیقی اور تنقیدی ہے وہاں ان میں تخلیقی پہلو بھی بھرپور طریقے سے موجود رہے ہیں جس کا اعتراف اور اقرار بہت سے محققین اور اہل علم نے کھلے دل سے کیا ہے۔

انوار احمد زئی نے اسی ضمن میں مزید رقم طراز کیا ہے کہ "'حالی کا ذہنی ارتقاء' جیسی معرکہ آرا اور شاندار تصنیف کا بھی یہی حال ہے کہ یہ تاریخ بھی ہے، تحقیق بھی ہے، تنقید بھی ہے، اور تخلیق بھی ہے اور اس میں یہ تمام عناصر ایک دوسرے کے ساتھ اس خوبصورتی سے مدغم اور یکجا ہیں کہ انہیں الگ الگ پہچاننا اور شناخت کرنا بھی ایک مشکل امر ہے"(ایضاً، ص ۱۱)۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کے تحقیقی اسلوب پر اثرانداز ہونے والے عوامل و محرکات

داخلی عوامل و محرکات کا تفصیلی جائزہ

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی تحقیقی نثر کی انفرادیت اور اس کی امتیازی خصوصیات کو بیان کرنے سے پہلے یقیناً یہ جاننا اور سمجھنا بے حد ضروری ہے کہ وہ کون سے محرکات اور اثرات تھے جنہوں نے آپ کے تحقیقی مزاج اور اسلوب پر اپنے گہرے اور انمٹ اثرات مرتب کیے اور اسے اس منفرد اور نمایاں صورت میں ڈھالا جس میں وہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان تمام خارجی و داخلی عوامل اور محرکات کو کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو آپ کے تحقیقی مزاج اور اسلوب پر اثر انداز ہوئے اور اس کی تشکیل و تعمیر میں اپنا کردار ادا کیا۔

داخلی عوامل اور محرکات کے بارے میں خود ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے ایک انٹرویو میں بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور اپنی زندگی کے ابتدائی دور اور اپنی تربیت کے بارے میں بتایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: "میری تربیت اور میری شخصیت کی تشکیل میں میری والدہ کا بہت بڑا اور بنیادی حصہ ہے اور ان کا مجھ پر بہت گہرا احسان ہے۔ میری والدہ بہت بہادر، حوصلہ مند، اور باہمت خاتون تھیں اور ان کی شخصیت بے حد متاثر کن تھی۔ ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کا گہرا خوف اور خشیت تھی، قرآن مجید کی روزانہ تلاوت اور تفاسیر کا گہرا اور مستقل مطالعہ ان کا معمول تھا، اور اللہ والوں کی باتیں اور بزرگان دین کے ملفوظات و اقوال ان کی زندگی کا لازمی جزو تھے۔ یہ ہمارے گھر کی مجموعی تربیت تھی اور یہ ہمارے گھر کا ماحول تھا جس نے میری شخصیت کو سنوارا اور نکھارا۔ اسی خاص تربیت اور اس مخصوص ماحول نے میری زندگی میں ایک حقیقی انقلاب برپا کر دیا اور میری سوچ، میرے مزاج، اور میرے طرزِ زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا" (رسالہ "تحریر و تصویر"، ص ۲۱)۔

اس وضاحت سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی زندگی اور ان کے تحقیقی مزاج کی تشکیل میں درج ذیل داخلی عوامل نے بنیادی اور کلیدی کردار ادا کیا: اول، گھر کا دینی ماحول جو قرآن و سنت اور بزرگان دین کی تعلیمات سے معمور تھا اور جس نے ان کی شخصیت کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ دوم، ایک سنجیدہ اور پُر سکون علمی فضا جس میں مطالعہ، تفکر، اور علم سے شغف کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ سوم، تربیت کا وہ مخصوص اور منفرد انداز جس میں ماں کی شفقت، دینی تعلیمات کی پابندی، اور علمی ذوق کی آبیاری سب یکجا تھے۔ یہ وہ بنیادی عوامل اور محرکات تھے جنہوں نے بچپن ہی سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی طبیعت و مزاج میں سنجیدگی، مستقل مزاجی، قرآن فہمی، سادگی، اور سچائی جیسی اعلیٰ اور نادر صفات کو کچھ اس طرح جاگزیں اور راسخ کر دیا کہ یہ تمام صفات نہ صرف ان کی شخصیت کا حصہ بنتی چلی گئیں بلکہ ان کے تحقیقی مزاج اور اسلوب کا بھی ایک لازمی اور ناقابل تسخیر حصہ بن گئیں۔ مختلف محققین اور اہل علم نے آپ کے اسلوب کی روانی، سلاست، اور شگفتگی کو سراہتے ہوئے اسے آپ کی شخصیت کا ہی ایک فطری اور لازمی حصہ قرار دیا ہے اور ان محققین کے حوالہ جات پورے مقالے میں جگہ جگہ ملتے رہیں گے۔

یہی وہ اہم وجہ ہے کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی تحقیق چاہے وہ دینی موضوعات پر ہو یا ادبی موضوعات پر، یہ داخلی محرکات اور عوامل ہر جگہ کارفرما نظر آتے ہیں اور ان کی تحریروں میں ان کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔ گھر کے دینی ماحول اور بزرگانِ دین سے محبت رکھنے والی فطری طبیعت کی وجہ سے آپ دینی تحقیق کی طرف راغب اور اس سے مانوس ہوئے تو دوسری طرف گھر کی سنجیدہ اور علمی فضا، خاص طور پر علی گڑھ کی عظیم علمی درس گاہ کی تربیت نے آپ کی ادبی تحقیق کے شوق اور ذوق کو مزید بڑھایا اور اسے جلا بخشی۔ ابتدا میں آپ نے مختلف موضوعات پر علمی اور تحقیقی مضامین لکھے، پھر ان مضامین کے بعد تصانیف کا ایک طویل اور شاندار سلسلہ شروع ہوا جو نصف صدی سے بھی زائد طویل عرصہ پر محیط ہے اور جس میں آپ نے تحقیق کے مختلف میدانوں میں گراں قدر اور لازوال خدمات انجام دیں۔

خارجی عوامل و محرکات کا تفصیلی جائزہ

اب ہم خارجی عوامل اور محرکات کی طرف آتے ہیں تو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے اپنے قلم سے یہ اعتراف اور اقرار پڑھنے کو ملتا ہے کہ مختلف شخصیات نے انہیں مختلف طریقوں سے متاثر کیا اور مختلف علمی و ادبی مسائل و معاملات میں ان کی بھرپور مدد کی اور ان کی راہنمائی فرمائی۔ ان مؤثر اور راہنما شخصیات میں سرفہرست آپ کے استاد "پروفیسر ضیاء احمد بدایونی" کا نام آتا ہے جن کے قیمتی اور دانشمندانہ مشورے پر آپ نے پی ایچ ڈی کا اہم اور

طویل کام شروع کیااور اسے کامیابی سے مکمل کیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی معروف کتاب "انعمت علیہم "میں مختلف بزرگوں، اساتذہ، اور محسن شخصیات کا ذکر تحسین بھرے اور عقیدت آمیز کلمات کے ساتھ بھرپور طریقے سے ملتا ہے اور اس کتاب میں آپ نے جابجا اس بات کا اعتراف اور اقرار کیا ہے کہ ان تمام شخصیات کے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان پر بہت سے احسانات تھے اور ان کی راہنمائی اور شفقت نے ان کی علمی زندگی کو سنوارا اور نکھارا۔ اس تصنیف کے علاوہ بھی مختلف تصانیف میں جن شخصیات کے ادبی و تحقیقی اسلوب اور نثر کا آپ کے اندازِ نگارش پر گہرا اور انمٹ اثر ہے، ان میں سر فہرست مولوی عبدالحق اور حافظ محمود شیرانی صاحب کا نام آتا ہے۔ لہٰذا جہاں آپ کے خارجی عوامل و محرکات میں بہت سی دیگر شخصیات کا بھی اہم ہاتھ اور کردار ہے، وہاں خاص طور پر مولوی عبدالحق اور حافظ محمود شیرانی کی شخصیات اور ان کے اسالیب بھی نمایاں طور پر شامل ہیں اور ان کے اثرات آپ کی نثر میں صاف دکھائی دیتے ہیں۔ لہٰذا مناسب اور ضروری ہے کہ ایک نظر ان دونوں عظیم اور ممتاز حضرات کی تحقیقی نثر پر بھی ڈالتے چلیں تاکہ ان کے اثرات کو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی نثر میں بہتر طور پر شناخت کیا جاسکے۔

مولوی عبدالحق کا اسلوب اور اس کے اثرات

مولوی عبدالحق کا ذکر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی مختلف تحاریر اور تصانیف میں جگہ جگہ ملتا ہے اور ان کے تئیں آپ کا گہرا احترام اور عقیدت ظاہر ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق کے بارے میں اور خاص طور پر ان کے تحقیقی اسلوب کے بارے میں معروف اور ممتاز محقق ڈاکٹر سید عبداللہ رقم طراز ہیں کہ "ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اردو ادب کے اہم ترین ماخذوں اور شاہکاروں کے قدیم اور مستند متون چھپوا کر ان پر اپنے مخصوص انداز میں نہایت عالمانہ اور محققانہ تحقیقی مقدمے لکھے جو اپنی جگہ ایک قیمتی اور لازوال علمی سرمایہ ہیں۔ قدیم اردو کے بارے میں ان کے لکھے ہوئے یہ مضامین یک جا بھی شائع ہو چکے ہیں اور ان سے اردو زبان و ادب کی تاریخ کے بہت سے مخفی اور غیر واضح پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ عبدالحق کا اسلوب بیان صاف، سادہ، اور نہایت دلکش ہے اور اس میں ایک فطری اور سادہ سی خوبصورتی پائی جاتی ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے" (بہ حوالہ صفدر علی، س ن، ص ۱۶۳)۔

اسی طرح مولوی عبدالحق کے طرزِ تحریر اور ان کے اسلوبیاتی نظریات کے بارے میں ڈاکٹر سنبل نگار نے مزید تفصیل اور وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور ان کے موقف کو بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں: "مولوی صاحب بنیادی طور پر آسان، سادہ، اور عام فہم زبان کے پرزور قائل تھے اور انہوں نے اپنی تمام زندگی میں بار بار اس بات پر زور دیا کہ زبان کا بنیادی اور حقیقی مقصد ادائے خیال اور ترسیل معانی کا ایک مؤثر وسیلہ ہے، نہ کہ محض لفاظی اور عبارت آرائی کا ذریعہ۔ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارے خیالات، احساسات، اور جذبات دوسروں تک صحیح اور موثر طریقے سے پہنچائے جاسکیں اور ان کی ترسیل میں کوئی رکاوٹ یا الجھاؤ پیدا نہ ہو۔ پر پیچ اور الجھی ہوئی عبارت سے انھیں سخت نفرت تھی اور وہ اسے ترسیل معانی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ عربی اور فارسی کے نامانوس، ثقیل، اور مشکل الفاظ کا استعمال بھی انھیں سخت ناپسند تھا اور وہ اس کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کرتے رہے۔ ان کی پختہ اور مدلل رائے تھی کہ 'اگر دنیا کے مقبول ترین اور کامیاب ترین ادیبوں کی ایک جامع فہرست تیار کی جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ بیش تر یہ عزت، شہرت، اور قبولیت صرف اور صرف انہی ادیبوں کو ملی ہے جنھوں نے اپنے خیالات اور افکار کو آسان، شگفتہ، اور عام فہم زبان میں ادا کیا ہے اور عوام و خواص دونوں سے اپنا پیغام پہنچانے میں کامیاب رہے ہیں'" (سنبل نگار)۔

مذکورہ بالا بیان سے نہ صرف مولوی عبدالحق کا اسلوبیاتی نظریہ اور ان کا نقطہ نظر واضح طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے بلکہ خود ان کے اپنے نثری اسلوب کے بارے میں بھی ایک جامع اور واضح آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے تحقیقی اسلوب کو بھی بہتر طور پر سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کا موقع ملتا ہے کہ جن بزرگ اور ممتاز شخصیت کا ذکر خود ان کی اپنی تحریر کردہ کتب میں ملتا ہے اور جن سے وہ متاثر تھے، ان شخصیات کا تحقیقی مزاج اور معیار کیسا تھا اور ان کا اسلوب کس نوعیت کا تھا۔

حافظ محمود شیرانی کا اسلوب اور اس کے اثرات

حافظ محمود شیرانی اردو ادب کے ایک بہت بڑے اور نامور محقق تھے، جن کی تحقیقی تصانیف آج بھی کسی تعریف اور تعارف کی محتاج نہیں ہیں اور تحقیق کے میدان میں ان کا نام ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ حافظ محمود شیرانی کی تحقیقی نثر بنیادی طور پر قانونی اور استدلالی ہے اور اس میں ایک خاص قسم کی منطقی قوت اور عقلی استدلال پایا جاتا ہے۔ مدلل اور پختہ اندازِ بیان اور ہر مسئلے کی بھرپور اور تشنہ نہ چھوڑنے والی وضاحت آپ کے مقالات اور تحریروں کی سب سے نمایاں اور امتیازی خوبی ہے۔ آپ کا تحقیقی اسلوب بھی انتہائی سنجیدہ، متین، اور سادہ ہے اور اس میں کسی قسم کی غیر ضروری رنگینی یا لفاظی نہیں پائی جاتی۔

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے اپنے معروف اور مستند تحقیقی مقالے میں لکھا ہے کہ "مولانا حالی سے فوراً بعد کی پشت میں علمی اسلوب کے اعتبار سے جو دو نمایاں ترین اور بلند پایہ شخصیتیں ہمارے سامنے آتی ہیں اور جنھوں نے اردو نثر کے علمی اسلوب کو نئی بلندیوں اور نئی جہتوں سے آشنا کیا، وہ مولوی عبدالحق اور حافظ محمود شیرانی ہیں۔ یہ دونوں بزرگ مولانا حالی سے بہت متاثر تھے اور ان کی تحریروں اور ان کے اسلوب کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی اسالیب پر بھی مولانا حالی کی گہری چھاپ اور ان کے اثرات صاف نظر آتے ہیں اور ان کے اسلوب میں مولانا حالی کی سادگی، متانت، اور وقار کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے" (مظہر محمود شیرانی، جلد دوم، ص ۹۳۹)۔

مولوی محمد شفیع صاحب نے حافظ محمود شیرانی کے اسلوب کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ہے: "شیرانی صاحب کا اسلوبِ تحریر سادہ، بے تکلف، اور ہر قسم کی غیر ضروری آرائش سے خالی مگر اسی کے ساتھ نہایت پختہ، مضبوط، اور توانا ہے۔ ان کا استدلال قوی، زوردار، اور مسکت ہے اور وہ قاری کو اپنی دلیل سے قائل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ مسئلہ زیر بحث کو مختلف زاویوں سے دیکھ کر، اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر کے، اور قاری کے ذہن میں ابھرنے والے تمام ممکنہ سوالات اور دخل ہائے مقدر کو پہلے سے بھانپ کر انہیں ہر طرح سے رفع کرنے کی بھرپور سعی کرتے ہیں اور مضمون کا ہر طرف سے مکمل احاطہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ اعتراض اور تنقید کے لیے کوئی گنجائش یا موقع باقی نہ رہے۔ ان کا بیان انتہائی متین، سنجیدہ، اور باوقار ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود اگر موقع اور محل کی مناسبت سے ہنسانا ممکن ہوتا ہے یا عبارت میں کوئی شگفتگی اور ظرافت پیدا کی جاسکتی ہے تو وہ اس موقع سے بھی نہیں چوکتے اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں" (ایضاً، ص ۹۵۱)۔

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے حافظ محمود شیرانی کی اسلوبیاتی انفرادیت پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے: "جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، اردو کے علمی اسلوب میں دلچسپی، شگفتگی، اور تحریر کی اس نئی اور تازہ جہت کا اضافہ درحقیقت شیرانی صاحب ہی کی دین اور ان کا امتیازی وصف ہے۔ ان کی متانت بلیغ ہونے کے ساتھ ساتھ خوشگواریوں، لطافتوں، اور دلآویزیوں کی حامل بھی ہے اور ان کی تحریر پڑھتے ہوئے قاری کو کہیں بھی خشکی یا اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ تاہم اس لطافتِ بیان اور شگفتگی میں تصنع اور بناوٹ کا شائبہ بھی ہرگز نہیں پایا جاتا اور یہ سب کچھ انتہائی فطری اور بے تکلف انداز میں عبارت میں شامل ہو کر اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے" (ایضاً، ص ۹۵۲)۔

مذکورہ بالا تمام تفصیلی بیانات میں جس شگفتگی، دلچسپی، اور اسلوبیاتی لطافت کی بات کی جارہی ہے، گو کہ اس کی اولیت اور ابتدا بقول ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کے، حافظ محمود شیرانی کی وجہ سے ہے، لیکن یہی شگفتگی، دلچسپی، اور اسلوبیاتی حسن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے اسلوب کا بھی ایک خاصہ اور امتیازی نشان ہے اور ان کی تحریروں میں بھی یہ صفت بھرپور طریقے سے موجود ہے۔ جس طرح مولوی عبدالحق کا ذکر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی تحریروں میں جگہ جگہ ملتا ہے، اسی طرح حافظ محمود شیرانی کا ذکر بھی ان کی تحریروں میں احترام اور عقیدت کے ساتھ ملتا ہے۔ مقالہ نگار کی تحقیقی

رائے کے مطابق مذکورہ دونوں عظیم اشخاص یعنی مولوی عبدالحق اور حافظ محمود شیرانی، دونوں ہی محققین کی تحقیقی نثر اور اسلوب کا ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی تحقیق اور اسلوب پر براہِ راست اور گہرا اثر ہے اور یہ اثر ان کی تحریروں کو بغور پڑھنے پر صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر مسرور احمد زئی نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ "۔۔۔ورنہ محمود شیرانی اور ڈاکٹر محمد اقبال سے بھی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان بہت متاثر ہیں اور ان کے افکار و نظریات کے اثرات ان کی شخصیت اور ان کی تحریروں پر پڑے ہیں۔ محمود شیرانی سے تو آپ نے خاص طور پر فیض حاصل کیا اور ان سے براہِ راست استفادہ کا موقع ملا۔ اپریل ۱۹۳۱ء میں آپ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے لاہور گئے تھے اور وہاں ان سے ملاقات کر کے ان کی راہنمائی اور شفقت سے بہرہ ور ہوئے تھے" (مسرور احمد زئی، ص۹۹)۔

گو کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے اساتذہ، محسنین، اور راہنمائی کرنے والی شخصیات کی فہرست بہت طویل ہے اور اس پر الگ سے تفصیلی بحث کی ضرورت اور گنجائش ہے، لیکن اس وقت یہاں پر ہمارا اصل موضوع ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے اسلوب اور ان کی تحقیقی نثر کا ذکر ہے۔ اور اس حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ "نثر محمود شیرانی" کافی حد تک ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی نثر جیسی ہے اور ان دونوں میں بہت سی مماثلتیں اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یوں سید سلمان ندوی اور دیگر اساتذہ و محسنین کے علاوہ مولوی عبدالحق اور حافظ محمود شیرانی کے تحقیقی اسلوب کا ڈاکٹر غلام مصطفیٰ پر بہت گہرا اور انمٹ اثر پڑا ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور حافظ محمود شیرانی کے محققانہ اسلوب کے اس تفصیلی جائزے کے بعد ان کے اسلوب کی جو خوبیاں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں، وہ یہ ہیں: اول، سادگی بیان اور تکلف و تصنع سے اجتناب۔ دوم، شگفتگی اور دلچسپی جس سے قاری کی توجہ برقرار رہتی ہے۔ سوم، رواں، عام فہم، اور سلیس اسلوب جو ہر سطح کے قاری کے لیے قابل فہم ہے۔ اور چہارم، استدلالی اور منطقی قوت جو قاری کو قائل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لہٰذا مذکورہ خوبیوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ تمام خوبیاں نثر غلام مصطفیٰ خان میں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں اور ان کی تحریریں انہی خوبیوں کی عملی مثال ہیں۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے منتخب نثری نمونوں کا فنی و فکری تجزیہ

اب ہم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی نثر کے مختلف نمونوں کا ایک مربوط اور تفصیلی فنی و فکری تجزیہ پیش کریں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ان کی تحقیقی نثر کن خصوصیات کی حامل تھی اور وہ کس معیار کی نثر نگاری کرتے تھے۔

نمونہ اول: "حضرت مجدد الف ثانی: ایک تحقیقی جائزہ" سے ایک اقتباس کا تجزیہ

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی معروف اور اہم تصنیف "حضرت مجدد الف ثانی: ایک تحقیقی جائزہ" میں انہوں نے انتہائی اعتدال، توازن، اور علمی دیانت کو برقرار رکھتے ہوئے شیخ محمد اکرام کے ان اعتراضات کا مدلل اور مسکت انداز میں جواب دیا ہے جو انہوں نے حضرت مجدد الف ثانی کے بارے میں اپنی کتاب "رود کوثر" میں پیش کیے تھے۔ اس پوری کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف اعتراضات کے مضبوط اور معقول جوابات دیے بلکہ اس دوران اسلوب کے معیار اور نثر کی خوبصورتی کا بھی بھرپور خیال رکھا۔ ان کا مواد بھی مکمل طور پر مستند، معتبر، اور قابل اعتماد تھا اور اسلوب بھی اپنی جگہ اعلیٰ معیار کا حامل تھا اور اس میں کسی قسم کی کمزوری یا خامی نہیں پائی جاتی تھی۔ کسی قسم کے اضافی جملوں یا غیر ضروری لفظوں کا جوش تحقیق میں استعمال نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی کسی قسم کی جذباتی یا غیر معقول زبان کا سہارا لیا گیا تھا۔ حشو و زوائد سے پاک، صاف ستھری، اور سلیس زبان استعمال کی گئی تھی اور دھیمے، نرم، اور انتہائی معتدل انداز میں تحقیقی نکتہ نظر سے اعتراضات کے جوابات دیے گئے تھے۔ ان کی نثر رواں اور سلیس ہے اور اس میں ایک فطری بہاؤ اور روانی پائی جاتی ہے۔

اسی تحقیقی جائزے میں ایک جگہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان تحریر فرماتے ہیں: "علماء اور 'صلی' کے قتل کے سلسلے میں فاضل مصنف کو مجبوراً یہ لکھنا پڑا کہ اکبر نے کئی بزرگوں کو مکاری اور حیلہ سازی سے، بغیر کسی باقاعدہ مقدمے یا داد فریاد کے شہید کروا دیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں یہ بھی تسلیم کرنا

پڑا کہ جن مشکلوں سے اکبر کا سابقہ پڑا وہ ملک میں بہت تھیں اور اس کے عقائد کے خلاف ایک عام شورش ہو گئی تھی۔ یعنی فاضل مصنف کو اکبر کے مخصوص عقائد اور ان عقائد کے خلاف پیدا ہونے والی شورش کا اعتراف ہے۔ گویا وہ بھی بدایونی کے بیان کردہ واقعہ قضائے امت (۹۸۷ھ) کے کم و بیش قائل ہیں اور اسے تسلیم کرتے ہیں۔ پھر جن بزرگوں کو، بقول ان کے، مکاری اور حیلہ سازی سے شہید کروادیا گیا تھا، ان کے سلسلے میں یہ سوال تو پیدا ہوتا ہے کہ کیا اکبر نے کسی وزیر یا مدبر کی رائے بھی لی تھی یا اس نے یہ سب کچھ اپنی انفرادی رائے اور فیصلے سے کیا؟ ایسا سوال ان کے قارئین بجا طور پر کر سکتے ہیں اور یہ ایک جائز اور فطری سوال ہے" (غلام مصطفیٰ خان، "حضرت مجدد الف ثانی: ایک تحقیقی جائزہ"، ص ۸)۔

مذکورہ بالا اقتباس میں تاریخ میں ہونے والے واقعات کو جس طرح شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب "رود کوثر" (تیسرا ایڈیشن) میں مسخ کرنے کی شعوری کوشش کی ہے اور حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کیا ہے، اس کے جواب میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے نہایت مدلل، عقلی، اور منطقی دلائل اور فطری سوالات کے ذریعے ان تمام غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کو دور کرنے کی کامیاب سعی کی ہے اور حقیقت کو اس کی اصلی صورت میں سامنے لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہ ادبی تحقیق کی اس جامع اور معیاری تعریف پر پوری طرح پورا اترتا ہے جس کے مطابق کسی بھی مسئلہ یا معاملے پر چھان پھٹک کر کے اس میں مہیا کردہ غلط معلومات کی تصحیح مضبوط اور مستند دلائل کی روشنی میں کی جاتی ہے اور حقائق کو ان کی اصلی حالت میں سامنے لایا جاتا ہے۔

نمونہ دوم: "حالی کا ذہنی ارتقاء" سے منتخب اقتباسات کا تجزیہ

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی ایک اور اہم اور معرکہ آرا تصنیف "حالی کا ذہنی ارتقاء" میں ان کے تحقیقی اسلوب کی متعدد خوبیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس کتاب سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں: "سر سید مولانا حالی سے بیس (۲۰) برس بڑے تھے اور ان کی عمر کا یہ فرق بھی ان کے تعلق کو استاد اور شاگرد کے رشتے میں ڈھالنے کا باعث بنا۔ انھوں نے مسلمانوں کے زوال و ادبار، غدر کے ہولناک اور دلخراش کشت و خون، پھر اس کے بعد مشتبہ اور بے گناہ لوگوں کے ساتھ انگریزوں کا بہیمانہ اور وحشیانہ برتاؤ، اور اس سب کے نتیجے میں قوم پر پڑنے والے تباہ کن اثرات وغیرہ، الغرض سب کچھ اپنے دل کی آنکھوں سے بہت قریب سے دیکھا تھا اور بصیرت کی نگاہوں سے اسے جانا اور پہچانا تھا۔ وہ سرکاری ملازمت میں رہنے کے باوجود بھی خدمتِ قوم کی ایک زبردست اور غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے اور ان کے اندر قوم کی بہتری اور ترقی کا ایک ناقابل تسخیر جذبہ اور عزم موجزن تھا" (غلام مصطفیٰ خان، "حالی کا ذہنی ارتقاء"، ص ۸)۔

مذکورہ بالا اقتباس درحقیقت ایک تحقیقی مقالے سے ماخوذ ہے لیکن اس میں تحریر کے اختصار، جامعیت، اور برجستگی کو دیکھیے کہ "و" اور "زیر" جیسی تراکیب واضافت کے خوبصورت اور برمحل استعمال کے ساتھ نثر کو کس قدر جامع، مربوط، اور معنی خیز بنا دیا ہے۔ یعنی "غدر کے کشت و خون"، "زوال و ادبار"، اور "خدمتِ قوم" جیسے موزوں اور بلیغ لفظوں اور تراکیب کے ذریعے پورے پیراگراف کو نہ صرف مختصر اور جامع بنایا گیا ہے بلکہ اسے انتہائی سادہ، عام فہم، اور پر اثر بھی بنا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ "زبردست" جیسے موزوں اور برجستہ لفظ کا استعمال کر کے سر سید کے جذبے اور ان کی لگن کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے اور ان کی عظمت کا اعتراف کیا گیا ہے۔

اسی کتاب میں ایک اور جگہ پر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان تحریر فرماتے ہیں: "حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ غالب جو اسی سال ترکیب بند کی شکل میں لکھا گیا تھا، وہ نہ صرف اپنی نوعیت اور ساخت کے اعتبار سے دوسرے تمام مرثیوں سے مختلف ہے بلکہ حقیقی اور سچے جذبات کے اظہار میں بھی اپنی مثال آپ ہے اور اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس مرثیے نے اپنی انہی انفرادی خصوصیات کی بدولت ایک بالکل نئے مرثیے کی بنیاد ڈالی اور اس کی راہ ہموار کی اور تمام تر تصنع، تکلف، اور بناوٹ سے بے نیاز ہو کر سچے اور حقیقی جذبات کی صحیح اور مخلصانہ ترجمانی کی۔ اس مرثیے کی روانی، برجستگی، اور سلاست کے ساتھ ساتھ اس کی فصاحت بھی غضب کی ہے اور یہ سب مل کر اسے اردو مرثیہ نگاری کی تاریخ میں ایک منفرد اور بلند مقام عطا کرتے ہیں" (ایضاً، ص ۱۸)۔

اسی کتاب میں ایک اور مقام پر آپ تحریر فرماتے ہیں: "یہی وہ اہم اور فیصلہ کن زمانہ تھا جب کہ مولانا حالی نے نواب شیفتہ جیسے سخن فہم و سخن سنج، صاحب ذوق، اور شیدائے رسول ﷺ کی صحبت اور مصاحبت میں رہ کر نہ صرف ادب و اشعار میں پختگی اور پائیداری حاصل کی تھی بلکہ دین کے لیے ایک والہانہ، مخلصانہ، اور گہرا تعلق بھی پیدا کیا تھا۔ اور کم از کم اس بات میں تو کوئی شک اور شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے دینی جوہر اور ان کی مذہبی صلاحیتوں کو اسی مصطفوی تعلق اور شیفتگی کی وجہ سے جلا اور نکھار ضرور حاصل ہوئی تھی اور وہ اس صحبت کی برکت سے اور زیادہ ابھر کر سامنے آئی تھیں۔ چنانچہ عربی نظم و نثر، مولود شریف، اور نعتیہ قصیدے سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں اور اسی بابرکت زمانے کی گرانقدر یادگار ہیں۔ لیکن اس قسم کے تمام ادبی جواہر ریزوں اور شاہکاروں میں ایک خاص بات جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی قدامت اور پرانے پن کے باوجود نہایت سلیس، برجستہ، اور رواں ہیں اور ان کے "تکلف" میں بھی کوئی تصنع، بناوٹ، یا دکھاوا نہیں ہے بلکہ وہ انتہائی فطری اور سادہ ہیں" (ایضاً، ص ۲۱)۔

نمونہ سوم: "ہمارا علم و ادب" سے اقتباسات کا تجزیہ

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی تحقیقی و تنقیدی تصنیف "ہمارا علم و ادب" سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں جس میں ان کے اسلوب کی مختلف خوبیاں دیکھی جا سکتی ہیں: "حزب اللہ اور حزب الشیطان کی جنگ ازل سے ہے اور یہ وہ بنیادی اور ابدی کشمکش ہے جو انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی۔ شیطان کو خواہ مخواہ اور بلا کسی حکمت اور مصلحت کے پیدا نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کی تخلیق کے پیچھے بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت ضرور کار فرما تھی۔ ابو جہل اور ابو لہب بھی بلا وجہ اور بغیر کسی سبب کے اسلام سے برسرِ پیکار نہیں تھے بلکہ اس کے پیچھے بھی مختلف اسباب اور عوامل تھے جن کا تاریخی اور علمی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ سفید و سیاہ، نیک و بد، حق و باطل، اور نور و ظلمت جیسی متناقض اور متضاد چیزیں اس لیے ہیں اور ان کا وجود اسی لیے ضروری ہے کہ وہ انسان جس کے لیے پوری کائنات کو پیدا کیا گیا ہے اور جسے اس کائنات کا مرکز و محور بنایا گیا ہے، خیر و شر میں تمیز کر سکے، اپنی راہ سے گندگیوں اور رکاوٹوں کو ہٹا سکے، اور خود کو صراطِ مستقیم پر چلا سکے اور اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہ سکے" (غلام مصطفیٰ خان، "ہمارا علم و ادب"، ص ۹)۔

مذکورہ بالا اقتباس آپ کی تحقیقی و تنقیدی تصنیف "ہمارا علم و ادب" سے ماخوذ ہے اور یہ پیراگراف اس کتاب میں موجود ایک اہم اور فکر انگیز مضمون سے لیا گیا ہے جس کا عنوان "برصغیر میں حق و باطل کے معرکے: ایک اجمالی جائزہ" ہے۔ جیسا کہ اس مضمون کے عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ اس میں حق اور باطل کے درمیان ہونے والے معرکوں کے بارے میں اظہارِ خیال کیا جائے گا، لہٰذا اسی مناسبت سے جب ہم اس کے پہلے ہی اقتباس کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ایک مختصر مگر انتہائی جامع، مربوط، اور خوبصورت تمہید ملتی ہے جو بڑی سادگی اور فصاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ "حزب اللہ" اور "حزب الشیطان" جیسی بلیغ اور معنی خیز تراکیب سے لے کر متضاد چیزوں کے بیان تک نثر کا ایک مربوط، متناسب، اور ہم آہنگ نمونہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ حرفِ عطف اور اضافت سے خوبصورتی اور برجستگی کے ساتھ کام لے کر مختصر ترین اور جامع ترین لفظوں میں مافی الضمیر کو بیان کر دیا گیا ہے اور وہ بھی اس خوبصورت اور مؤثر انداز میں کہ مذکورہ بالا پیراگراف سے اگر کوئی بھی ایک لفظ بھی نکال دیا جائے تو پوری بات ادھوری اور نامکمل تصور کی جائے گی۔ اور نہ ہی مفہوم کسی طرح تشنہ اور نامکمل ہے کہ مزید فقروں یا جملوں کی ضرورت باقی رہے اور قاری کے ذہن میں کوئی ابہام یا سوال رہ جائے۔ پوری کتاب میں ہی ایک اعلیٰ ادبی اسلوب موجود ہے اور ہر مضمون میں اس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

اسی تصنیف سے ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں: "اللہ پاک کا بے حد اور لامحدود شکر و احسان ہے کہ اس نے انسان کو قوتِ گویائی کی عظیم اور لازوال نعمت سے نوازا اور اسے اشرف المخلوقات کا مقام عطا فرمایا۔ اس نے اپنے کلام، قرآن مجید، نیز اپنے پیارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام اور ارشادات کے ذریعے اسے بات کرنے کا سلیقہ، تہذیب، اور طریقہ سکھایا اور اسے حیوانوں سے ممتاز کیا۔ یعنی قرآن و حدیث کے بے شمار الفاظ،

تراکیب، اور محاورات نے عرب اور غیر عرب میں فصاحت اور بلاغت کو چار چاند لگا دیے اور وہاں کے ادب کو صحیح معنی میں 'ادب' بنایا اور اسے ایک اعلیٰ اور معیاری مقام عطا کیا" (ایضاً)۔

مذکورہ بالا اقتباس انتہائی سادہ، شگفتہ، اور عام فہم انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ چونکہ اللہ پاک کے شکر اور احسان کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے، لہٰذا مذکورہ پارے میں "بے حد" جیسے موزوں اور بامعنی لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ پھر "قوت گویائی" جیسی جامع، بلیغ، اور معنی خیز ترکیب بیان کر کے انسان کو اس نعمت عظمیٰ پر احسان مند ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نہ تو کوئی تشبیہ ہے اور نہ ہی کوئی استعارہ، بلکہ نہایت سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ، جس میں ایک خاص قسم کی معصومیت اور خلوص بھی محسوس ہوتا ہے، "اپنے پیارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" جیسا پُر تاثیر اور دلی کلمہ نعت استعمال کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب چاہتے تو نبی آخر الزماں ﷺ کی شان اقدس میں لفظوں کی طویل فہرستیں پیش کر سکتے تھے، بے پناہ القاب و آداب کا استعمال کر سکتے تھے، اور عبارت کو رنگین اور پُر تکلف بنا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے زبان کی رنگینی اور لفظی بازی گری سے زیادہ معنی کی ترسیل اور مفہوم کی وضاحت پر اپنی توجہ مرکوز رکھی تاکہ ابلاغ کا حق مکمل طور پر ادا ہو سکے اور پیغام صحیح طور پر قاری تک پہنچ سکے۔ ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی مقالات اور تصانیف کی یہ سب سے بڑی خوبی اور امتیازی وصف ہے کہ چاہے کوئی نو آموز اور نیا محقق انہیں پڑھے یا کوئی عالم و فاضل اور پختہ کار محقق، یا پھر ادب کا ایک عام قاری جسے تحقیق کے اصولوں اور طریقوں سے کوئی خاص آگاہی نہیں ہے، آپ کی تحریر کی سادگی، شگفتگی، اور دلآویزی آخری وقت تک اور آخری صفحے تک کتاب کو پڑھنے پر مجبور کرتی ہے اور قاری کو اپنی گرفت میں لیے رہتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی عام فہم، سادہ، اور شگفتہ انداز ہے جو آپ کی نثر کا سب سے بنیادی اور سب سے نمایاں وصف ہے اور جس نے اسے ہر خاص و عام کے لیے قابل قبول اور پر لطف بنا دیا ہے۔

نمونہ چہارم: "مطالب القرآن" سے اقتباسات کا تجزیہ

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی دینی تحقیقی تصانیف میں "مطالب القرآن" ایک بہت اہم اور قابل قدر مقام رکھتی ہے۔ اس کتاب کا آغاز سورہ الفاتحہ سے ہوتا ہے اور اختتام سورہ فلق اور سورہ ناس پر ہوتا ہے۔ پوری کتاب میں انتہائی سادہ، سلیس، اور عام فہم زبان میں قرآن مجید کی سورتوں کے مطالب اور مضامین کو بیان کیا گیا ہے۔ صرف سورہ فاتحہ کی مثال دی جائے تو ڈاکٹر صاحب نے پہلے "بہ نام سورہ فاتحہ" کے عنوان سے اس کا تعارف تحریر کیا ہے اور پھر اس کے بارے میں مختلف روایات کا حوالہ بھی دیا ہے۔ آخر میں لفظ "آمین" کی تشریح و توضیح بھی نہایت خوبصورت اور سادہ انداز میں کی ہے کہ یہ کب اور کیوں بولا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان لکھتے ہیں: "یہ میں نام مختلف روایات میں مذکور ہیں اور یہ اس سورت کی عظمت اور اہمیت کی دلیل ہے۔ اسی لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سورت تمام قرآن مجید کا خلاصہ، نچوڑ، اور لب لباب ہے اور اس کے بغیر کوئی بھی رکعت مکمل اور مقبول نہیں ہوتی اور نماز میں اس کا پڑھنا فرض اور لازمی ہے" (غلام مصطفےٰ خان، "مطالب القرآن"، ص ۵)۔

اور آخر میں لفظ "آمین" کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "سورہ فاتحہ کے اختتام پر آمین پڑھنا بھی سنت ہے اور یہ ایک مسنون اور پسندیدہ عمل ہے جس کے معنی ہیں 'ایسا ہی کر'، یا 'قبول فرما'، یا 'ہماری دعا قبول فرما'۔ یہ لفظ قرآن مجید میں شامل نہیں ہے اور نہ ہی یہ قرآن کا حصہ ہے، لیکن اس کا ادا کرنا اور پڑھنا پسندیدہ اور مستحب ہے کیونکہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا پسندیدہ عمل ہے اور آپ سے ثابت ہے۔ مختصر یہ کہ سورہ فاتحہ حمد و ثنا بھی ہے، دعا بھی ہے، اور خیر و شر کی تاریخ سے آگہی کے لیے ایک جامع اور مکمل اجمالی جائزہ بھی ہے جو انسان کی فلاح دارین، دنیا و آخرت کی کامیابی، کے لیے ایک کامل اور مکمل ذریعہ ہے اور اس میں ہر وہ چیز موجود ہے جس کی انسان کو اپنی نجات کے لیے ضرورت ہے" (ایضاً، ص ۸)۔

مذکورہ اقتباس میں ڈاکٹر صاحب کے قرآن مجید سے گہرے شغف اور وسیع المطالعہ ہونے کی خوبی سامنے آتی ہے تو وہیں ان کی تحریر کی سلاست، سادگی، اور جامعیت کی بھی بھرپور اور واضح مثال ملتی ہے۔ سورہ فاتحہ کی فضیلت، اہمیت، اور اس کے مختلف پہلوؤں کو انتہائی جامع اور آسان الفاظ میں

بیان کیا گیا ہے اور حشو و زوائد سے پاک، صاف ستھرا، اور شستہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ پوری کتاب میں یہی سادگی، یہی سلاست، اور یہی عام فہم اور واضح اندازِ نثر پایا جاتا ہے اور اس کا ایک ایک لفظ اس کی گواہی دیتا ہے۔

فنی و فکری تجزیے کے لیے بنیادی ادبی اصطلاحات کا تعین اور ان کی وضاحت

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی نثر کے فنی اور فکری تجزیے کو آگے بڑھانے سے قبل یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم چند بنیادی اور کلیدی ادبی اصطلاحات کی تعریف اور ان کے مفہوم کا جائزہ لے لیں تاکہ ان کی روشنی میں ڈاکٹر صاحب کی نثر کا زیادہ بہتر، مربوط، اور معیاری تجزیہ کیا جا سکے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ زیرِ تحقیق ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی نثر مقفّٰی ہے یا پھر سہل، سلیس، اور رواں ہے اور اس میں کون کون سے اسلوبیاتی خواص پائے جاتے ہیں، کیونکہ یہ ہمارے پورے مقالے کا ایک اہم اور کلیدی حصہ ہے۔ اس حصے میں ڈاکٹر صاحب کی دینی و ادبی تحقیق کو ان کے اسلوب یا اندازِ تحریر کے تناظر میں دیکھا اور پرکھا جائے گا۔ لہٰذا پہلے مقفّٰی اور مُسَجَّع کی تعریف اور ان کے فرق پر ایک تفصیلی نظر ڈال لیتے ہیں۔

پروفیسر انوار جمال نے اپنی معروف اور مستند کتاب میں نثر کی ان اقسام کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ایسی عبارت کو مُسَجَّع کہتے ہیں جس میں کسی فقرے کے الفاظ دوسرے فقرے کے الفاظ سے ہم وزن اور ہم قافیہ ہوں اور ان میں ایک خاص قسم کی موسیقیت اور نغمگی پائی جائے۔ شاعری میں یہی اصطلاح صنعتِ ترصیع کے نام سے جانی اور پہچانی جاتی ہے۔ یعنی اگر نثر میں یہ خوبی اور یہ صفت پائی جائے تو وہ نثر مُسَجَّع کہلاتی ہے اور اسے نثر کی ایک اعلیٰ اور مشکل قسم سمجھا جاتا ہے" (انوار جمال، ص ۱۶۶)۔

اسی طرح انہوں نے مقفّٰی عبارت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ایسی عبارت جس میں فقروں اور جملوں کے آخر میں قافیوں کا التزام اور اہتمام کیا جائے اور انہیں ہم قافیہ بنانے کی شعوری کوشش کی جائے، وہ مقفّٰی عبارت کہلاتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے دور میں رجب علی بیگ سرور کی عبارت اور مرزا غالب کے خطوط کے بعض جملے اور فقرے مقفّٰی عبارت کے ذیل میں آتے ہیں اور اس کی بہترین مثالیں ہیں" (ایضاً)۔

مذکورہ بالا تعریفات کے مطابق ایسی عبارت جس میں فقرے کے الفاظ ہم وزن یا ہم قافیہ ہوں اور اس میں ایک خاص قسم کا تکلف، بناوٹ، اور تصنع پایا جائے، ایسی نثر مقفّٰی اور مُسَجَّع کہلاتی ہے۔ اس قسم کی عبارت میں بیان کی رنگینی، لفظی آرائش، اور مرصع سازی کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے اور معنی سے زیادہ الفاظ کی خوبصورتی پر توجہ دی جاتی ہے۔ لہٰذا جب ہم ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی نثر کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس میں قوافی کا التزام اور اہتمام نہیں ملتا اور نہ ہی اس میں کسی قسم کی بناوٹی رنگینی یا لفظی آرائش نظر آتی ہے۔ انتہائی سادہ، بے تکلف، اور فطری انداز میں بات کہہ دینا ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی نثر کی سب سے بڑی خوبی اور ان کا امتیازی وصف ہے۔ اگر ان کی نثر مقفّٰی اور مُسَجَّع نہیں ہے تو پھر یقیناً یہ سہل، رواں، اور سلیس ہو گی۔ آیئے اب دیکھتے ہیں کہ سہل، رواں، فصاحت، اور بلاغت کے کیا معنی ہیں اور کیا مذکورہ بالا ادبی اصطلاحات کے معیار پر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی نثر پوری اترتی ہے یا نہیں۔

پروفیسر انوار جمال سادگی کی تعریف اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مزید رقم طراز ہیں کہ "سادگی کسی بھی فن پارے کو فطرت کے قریب لاتی ہے اور اسے زیادہ حقیقی، زیادہ پر اثر، اور زیادہ دلفریب بنا دیتی ہے، جبکہ اس کے برعکس تصنع، بناوٹ، اور ملمع کاری فن پارے کو فطرت سے دور کر دیتی ہے اور اس میں ایک غیر فطری اور مصنوعی پن پیدا کر دیتی ہے جو قاری کو اکتاہٹ اور بیزاری کا شکار کرتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ استادی کا اظہار، علمی تبحر کا رعب جمانا، اور لفظی بازی گری کرنا سادگی کے خلاف ہے اور اس کی روح کو مجروح کرتا ہے۔ سادگی زیادہ پیچ و خم، زیادہ الجھاؤ، اور غیر ضروری پیچیدگی کو کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کر سکتی اور وہ ان سب سے گریز کرتی ہے" (ایضاً، ص ۱۵۵)۔

اسی طرح اگر سلیس اور سلاست کی اصطلاحی تعریف کی بات کی جائے تو پروفیسر انوار جمال اس سلسلے میں بڑی وضاحت اور جامعیت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ "یہ تحریر و تنقید کی ایک اہم اور بنیادی اصطلاح ہے۔ سلاست نثری تحریر کی ایک اعلیٰ اور مطلوب صفت ہے جس کی موجودگی نثر کو خوبصورت اور پر اثر بنادیتی ہے۔ تحریر کے لیے ایسے مناسب، موزوں، اور بر محل الفاظ کا انتخاب اور استعمال لانا جو سمجھنے میں آسان، عام فہم، اور معانی میں فصیح ہوں، یعنی ان میں ابلاغ اور ترسیل معانی کی قوت زیادہ اور موثر ہو، یہی سلاست کا جوہر ہے۔ سلاست در حقیقت سادگی کے بطن سے جنم لیتی ہے اور اس کی فطری پیداوار ہے۔ سادہ ترین اور آسان ترین الفاظ کا بر محل اور برجستہ انتخاب ہی دراصل 'عبارت' میں سلاست کا جمال اور حسن پیدا کرتا ہے جس سے پھر پوری عبارت میں ایک فطری روانی، بہاؤ، اور رعنائی پیدا ہوتی ہے اور قاری اسے پڑھتے ہوئے کسی قسم کی دشواری یا الجھاؤ محسوس نہیں کرتا" (ایضاً، ص۱۱۹)۔

اسی طرح اگر فصاحت کی جامع اور مکمل تعریف پر ایک نظر ڈالی جائے تو پروفیسر انوار جمال مزید رقم طراز ہیں کہ "فصاحت سے مراد الفاظ کا بر محل اور موقع و محل کے عین مطابق استعمال، مقتضائے حال کے مطابق بیان، اور کلام کی پاکیزگی یا صفائی ہے۔ کلام کے حوالے سے عموماً دو اصطلاحیں ہیں جو اکٹھی اور ایک ساتھ استعمال ہوتی ہیں اور ان کا آپس میں گہرا اور ناقابل تسخیر تعلق ہے: بلاغت اور فصاحت۔ بلاغت کی کیفیت بنیادی طور پر (Subjective) ہے، یعنی اس کا تعلق اور واسطہ معنی اور مفہوم سے ہے اور اس کا مدار اس بات پر ہے کہ بات کتنی موثر اور دلنشین ہے۔ اور فصاحت کی کیفیت (Objective) ہے، یعنی اس کا تعلق الفاظ اور ان کے استعمال سے ہے اور اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ الفاظ کتنے درست اور بر محل ہیں۔ لفظ، ترکیب، محاورہ، اور روزمرہ کا بر موقع اور مقتضائے حال کے عین مطابق استعمال 'فصاحت' کہلاتا ہے۔ یعنی ایسا کلام جو اہل زبان کے روزمرہ اور عام استعمال کے موافق ہو اور تنافر، غرابت، تعقید، تالیف، شتر گربہ، اور قیاس لغوی جیسے عیوب اور نقائص سے پاک اور صاف ہو، وہ فصیح ہے اور اس میں یہ وصف 'فصاحت' کہلاتا ہے۔ گویا مناسب، بر محل، اور بے عیب عبارت میں بات کرنا اور اپنا مدعا بیان کرنا ہی فصاحت ہے" (ایضاً، ص ۱۷)۔

چونکہ فصاحت اور بلاغت کو عموماً اکٹھا بولا، لکھا، اور سمجھا جاتا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں، لہٰذا چلتے چلتے "بلاغت" کی بھی مختصر مگر جامع ترین تعریف کا جائزہ لیتے چلیں، کیونکہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی نثر کا فنی اور فکری جائزہ ان تمام ادبی اصطلاحوں کے صحیح معنی و مفہوم کو سمجھے بغیر ممکن نہیں ہے اور نہ ہی ان کی نثر کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر انوار جمال بلاغت کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ "کلامِ بلیغ، ترسیلِ معانی کی وہ فطری اور مؤثر قوت اپنے اندر رکھتا ہے جس کی بدولت عبارت کا مفہوم و معنی بڑی تیزی، سہولت، اور وضاحت کے ساتھ ذہنِ سامع یا ذہنِ قاری تک منتقل ہو جاتا ہے اور اسے سمجھنے میں کوئی دشواری یا الجھاؤ پیش نہیں آتا۔ بلاغت دراصل کلام کی وہ کیفیت ہے جو اسے دلنشین، مؤثر، اور پر اثر بنادیتی ہے" (ایضاً، ص ۵۵)۔

یہ تمام ادبی اصطلاحات اور ان کی تعریفات مختصراً ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ اب ہم ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی نثر کے مختلف نمونوں کا انہی اصطلاحات اور ان کے معیارات کے تناظر میں بھرپور اور تفصیلی تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ان کی نثر ان میں سے کن کن اصطلاحات اور خوبیوں کی حامل ہے۔ مثال نمبر ۱ میں سادگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ فصاحت و بلاغت جیسی اعلیٰ اور نادر خوبیاں بھی بھرپور طریقے سے ملتی ہیں اور ان کی موجودگی صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ مثال نمبر ۲ اور مثال نمبر ۳ میں مذکورہ بالا تمام خوبیوں کے علاوہ حشو و زوائد اور غیر ضروری طوالت جیسے عیوب سے بھی مکمل پاکیزگی اور صفائی پائی جاتی ہے اور اس حوالے سے ان کی نثر ایک اعلیٰ معیار کی حامل ہے۔ تینوں پیروں کو بغور اور توجہ سے پڑھتے چلے جائیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان میں انتہائی توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ معنی و مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے اور مواد کے ساتھ ساتھ اسلوب کا بھی بھرپور خیال رکھا گیا ہے اور دونوں میں کمال درجے کا توازن اور تناسب پایا جاتا ہے۔

اب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی دیگر تصانیف کے نثری نمونوں کا بھی تجزیہ کرتے چلتے ہیں اور ان میں پائی جانے والی نثری خوبیوں یا خامیوں پر تفصیلی بحث کرتے ہیں۔ ان کے تمام منتخب نثری نمونوں کے گہرے اور باریک بینی سے کیے گئے مطالعے اور تجزیے کے بعد اس نتیجے پر پہنچنا ممکن ہے کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی نثر بنیادی طور پر سادہ، سلیس، رواں، شگفتہ، اور فصیح و بلیغ ہے اور اس میں مقفّٰی و مسجّع نثر کی پیچیدگیاں اور تصنع نہیں پایا جاتا۔ ان کی نثر میں ایک فطری اور سادہ خوبصورتی ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لیتی ہے اور اسے آخر تک پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی ان کی نثر کا سب سے بڑا کمال اور ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے تحقیقی اسلوب کی انفرادیت اور امتیازی خصوصیات

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی تحقیقی نثر کی انفرادیت اور اس کی امتیازی خصوصیات کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان کی نثر میں متعدد ایسی خوبیاں اور خصوصیات یکجا اور ہم آہنگ نظر آتی ہیں جو اسے اپنے ہم عصر محققین کی نثر سے ممتاز اور منفرد بناتی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی اور نمایاں خوبی سادگی و سلاست ہے جس کے تحت ان کی نثر میں کسی بھی قسم کے تکلف، تصنع، اور بناوٹ سے مکمل گریز کیا گیا ہے اور سادہ ترین، آسان ترین، اور عام فہم الفاظ کا انتخاب اور استعمال کیا گیا ہے جو ہر سطح کے قاری کے لیے قابل فہم اور پر لطف ہیں۔ دوسری اہم خوبی فصاحت و بلاغت ہے جس کا مظاہرہ ان کی نثر میں الفاظ کے بر محل اور موقع کے عین مطابق استعمال، مقتضائے حال کے مطابق بیان، اور کلام کی پاکیزگی و صفائی کی صورت میں ملتا ہے اور یہ ان کی تحریروں کو ایک اعلیٰ ادبی معیار عطا کرتی ہے۔

تیسری بڑی خوبی شگفتگی اور دلچسپی کا وہ عنصر ہے جو ان کی تحریروں میں بھرپور طریقے سے موجود ہے اور یہ خشک سے خشک اور مشکل سے مشکل تحقیقی موضوعات کو بھی دلچسپ، پر لطف، اور شگفتہ انداز میں پیش کرنے کی ان کی غیر معمولی صلاحیت کا غماز ہے، جس کی بدولت قاری کسی بھی قسم کی اکتاہٹ یا بیزاری محسوس کیے بغیر ان کی تحریروں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ چوتھی اہم خوبی ان کا استدلالی اور منطقی انداز ہے جس میں وہ مدلل، قانونی، اور عقلی نثر کے ذریعے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کی وضاحت اور تشریح کرتے ہیں اور قاری کو اپنی دلیل سے قائل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ پانچویں خوبی مستند اور معتبر حوالہ جات کا بھرپور استعمال ہے جس کے ذریعے وہ اپنے تحقیقی مواد کو مزید مستحکم، مضبوط، اور ناقابل تردید بناتے ہیں اور اسے علمی دنیا میں قابل قبول اور لائق اعتنا بناتے ہیں۔

چھٹی نمایاں خوبی ایجاز و اختصار ہے جس کے تحت ان کی نثر حشو و زوائد اور غیر ضروری طوالت سے پاک ہے اور مختصر، جامع، اور بھرپور جملوں میں معنی کی بھرپور ترسیل کی گئی ہے اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ساتویں اور آخری نمایاں خوبی وہ تخلیقی عنصر ہے جو ان کی تحقیقی اور تنقیدی نثر میں بھی بھرپور طریقے سے موجود ہے اور اسے محض خشک اور سپاٹ علمی اور تحقیقی نثر ہونے سے بچاتا ہے اور اس میں ایک ادبی اور تخلیقی حسن اور رعنائی پیدا کرتا ہے۔ یہ تمام خوبیاں مل کر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی نثر کو ایک منفرد اور امتیازی مقام عطا کرتی ہیں اور اسے اردو تحقیق نگاری کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے یادگار اور لازوال بنا دیتی ہیں۔

کراچی کی تحقیقی روایت میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا کلیدی کردار

ڈاکٹر انور سدید نے کراچی کی تحقیقی روایت کے حوالے سے اپنی معروف اور مستند کتاب میں لکھا ہے کہ "کراچی کی تحقیقی روایت کو مستحکم کرنے، اسے فروغ دینے، اور اسے ایک مضبوط اور منظم بنیاد فراہم کرنے میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے بھی ایک انتہائی اہم، کلیدی، اور ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے خود بھی تحقیق کے مختلف میدانوں میں گراں قدر، لازوال، اور قابل رشک خدمات سرانجام دیں اور اپنی تصانیف کے ذریعے تحقیقی سرمائے میں گراں قدر اور قیمتی اضافہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے نئے اور نوآموز تحقیقی کام کرنے والوں کی بھرپور سرپرستی اور راہنمائی بھی کی اور ان کی علمی تربیت میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ انہوں نے زبان کے ساتھ ساتھ ادبی اثرات کی دریافت، ان کی نشاندہی، اور ان کے تجزیے کا

اہم فریضہ بھی بڑی خوش اسلوبی اور مہارت کے ساتھ سر انجام دیا ہے اور اس حوالے سے بھی ان کا کام لائق تحسین اور قابل تقلید ہے"(سدید، ص ۶۵۳)۔

ان کے قائم کردہ دبستانِ تحقیق کے اہم اور نمایاں اراکین میں ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر شاہ علی، حبیب اللہ غضنفر، ڈاکٹر ایوب قادری، شبیر علی کاظمی، ڈاکٹر نجم الاسلام، ڈاکٹر سخی احمد ہاشمی، اور ڈاکٹر عبد القیوم جیسے نامور اور لائق محققین شامل ہیں جنہوں نے آگے چل کر خود بھی تحقیق کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور اس روایت کو آگے بڑھایا۔ یہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی علمی عظمت اور ان کی تربیتی صلاحیتوں کا ایک روشن ثبوت ہے کہ ان کے تلامذہ اور ان کے دبستان سے وابستہ افراد نے بھی تحقیق کے میدان میں نمایاں اور قابل ذکر کام کیا اور اپنے استاد کی روایات کو زندہ رکھا۔

نتائج اور حتمی تجزیہ

اس پورے تحقیقی مقالے میں پیش کیے گئے تفصیلی مباحث، مختلف پہلوؤں کے تجزیوں، اور منتخب نثری نمونوں کے گہرے مطالعے کی روشنی میں درج ذیل اہم اور بنیادی نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں جو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے تحقیقی اسلوب کی حقیقی نوعیت، اس کی خوبیوں، اور اس کی ادبی و علمی اہمیت کو واضح کرتے ہیں:

پہلا اور سب سے اہم نتیجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی تحقیقی نثر بنیادی اور مجموعی طور پر سادگی، سلاست، فصاحت، بلاغت، اور شگفتگی جیسی اعلیٰ اور نادر اسلوبیاتی خوبیوں کی حامل ہے اور ان کی نثر میں یہ تمام اوصاف ایک ساتھ اور ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ نظر آتے ہیں، جو اسے اردو تحقیق نگاری کی تاریخ میں ایک منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتے ہیں۔

دوسرا اہم نتیجہ یہ ہے کہ ان کے تحقیقی اسلوب اور ان کے مزاجِ تحقیق کی تشکیل و تعمیر پر گھریلو دینی ماحول، علی گڑھ کی علمی اور تربیتی فضا، اور مولوی عبد الحق و حافظ محمود شیرانی جیسے عظیم اور ممتاز محققین کے گہرے اور انمٹ اثرات مرتب ہوئے اور ان تمام عوامل نے مل کر ان کے اسلوب کو وہ منفرد اور امتیازی رنگ و آہنگ عطا کیا جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔

تیسرا اہم نتیجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی تحریریں اور تصانیف بیک وقت تحقیق، تنقید، اور تخلیق کے عناصر کو اپنے اندر یکجا اور مدغم کرتی ہیں اور یہ تینوں جہتیں ان کی نثر میں اس خوبصورتی اور ہم آہنگی کے ساتھ پیوست ہیں کہ انہیں الگ الگ کر کے دیکھنا اور شناخت کرنا بھی ایک مشکل امر ہے، اور یہی ان کی نثر کا سب سے بڑا کمال اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

چوتھا اہم نتیجہ یہ ہے کہ ان کی نثر مقفّٰی و مسجّع اسلوب کی پیچیدگیوں، تکلفات، اور بناوٹوں سے پوری طرح پاک ہے اور اس میں سادگی، روانی، اور فطری بہاؤ کو بنیادی اور مرکزی اہمیت حاصل ہے، جس کی بدولت ان کی تحریریں ہر سطح کے قاری کے لیے قابل فہم اور پر لطف ہیں اور انہیں پڑھتے ہوئے کسی قسم کی دشواری یا الجھاؤ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

پانچواں اہم نتیجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تمام تر تصانیف اور تحریروں میں مستند اور معتبر حوالہ جات، مدلل اور منطقی اندازِ بیان، اور قانونی و استدلالی نثر کے بھرپور اور موثر استعمال کے ذریعے اردو تحقیق نگاری کی روایت کو مستحکم کیا، اسے نئی بلندیوں سے آشنا کیا، اور آنے والے محققین کے لیے ایک روشن اور قابل تقلید مثال قائم کی۔

چھٹا اہم نتیجہ یہ ہے کہ کراچی کی تحقیقی روایت کی تشکیل، ترویج، اور استحکام میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا کردار بنیادی، کلیدی، اور سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور ان کے بغیر اس روایت کا تصور بھی شاید ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے نہ صرف خود تحقیق کے میدان میں گراں قدر کام کیا بلکہ دوسروں کو بھی اس میدان میں کام کرنے کی ترغیب دی اور ان کی سرپرستی کی۔

ساتواں اہم نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تحقیقی نثر میں حشو وزوائد، غیر ضروری طوالت، ابہام، پیچیدگی، تصنع، اور ملمع کاری سے مکمل طور پر گریز اور اجتناب کیا گیا ہے، جو ایک کامیاب اور پختہ کار محقق کی سب سے بڑی پہچان اور سب سے اہم خوبی ہے اور یہ ان کی نثر کو ایک اعلیٰ اور معیاری مقام عطا کرتی ہے۔

آٹھواں اور آخری اہم نتیجہ یہ ہے کہ "حالی کا ذہنی ارتقاء"، "حضرت مجدد الف ثانی: ایک تحقیقی جائزہ"، "ہمارا علم و ادب"، اور "مطالب القرآن" جیسی ان کی معروف اور شاہکار تصانیف میں ان کے تحقیقی اسلوب کی تمام نمایاں اور امتیازی خصوصیات کا بھرپور اور واضح مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور یہ تصانیف ان کے اسلوب کی بہترین اور مکمل مثالیں ہیں جو ان کے تحقیقی مزاج، ان کی علمی گہرائی، اور ان کی اسلوبیاتی پختگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی تحقیقی نثر اردو ادب کے تحقیقی سرمائے میں ایک گراں قدر، قیمتی، اور لازوال اضافہ ہے اور ان کا اسلوبِ تحقیق اپنی سادگی، سلاست، شگفتگی، اور استدلالی قوت کی بدولت نہ صرف اپنے دور میں ممتاز اور منفرد تھا بلکہ آج بھی نئے محققین کے لیے ایک روشن مثال، ایک قابل تقلید نمونہ، اور ایک مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تحقیق کو کس طرح دلچسپ، شگفتہ، اور ادبی انداز میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے اور اس میں کس طرح تحقیق، تنقید، اور تخلیق کے عناصر کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

درانی، عطش۔ (۲۰۱۱)۔ اصولِ ادبی تحقیق۔ لاہور: نذیر اکیڈمک پبلشرز۔

صفدر علی۔ (س ن)۔ اصولِ تحقیق و تدوین۔ لاہور: فاروق سنز۔

جین، گیان چند۔ (۲۰۱۲)۔ تحقیق کا فن۔ لاہور، کراچی، حیدرآباد: فکشن ہاؤس۔

غلام مصطفیٰ خان۔ حضرت مجدد الف ثانی: ایک تحقیقی جائزہ۔

غلام مصطفیٰ خان۔ حالی کا ذہنی ارتقاء۔

غلام مصطفیٰ خان۔ ہمارا علم و ادب۔

غلام مصطفیٰ خان۔ مطالب القرآن۔

فرخی، اسلم۔ تنقید و تحقیق۔

انوار احمد زئی۔ متفرقات۔

مظہر محمود شیرانی۔ حافظ محمود شیرانی اور اُن کی علمی و ادبی خدمات (جلد دوم)۔

مسرور احمد زئی۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، حالات و علمی خدمات۔

سدید، انور۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ۔

انوار جمال۔ (ادبی اصطلاحات کی کتاب)۔

رسالہ تحریر و تصویر۔

سنبل نگار۔ (مقالہ / کتاب)۔

امتِ مسلمہ بلکہ پوری انسانیت کے لیے روحانی سکون اور ہدایت کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔